یاد کیجئے

ہمارے رہنما

مترجم رفیق محمد شاستری

چلڈرن بک ٹرسٹ　قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان　بچوں کا ادبی ٹرسٹ

Portraits by B.G. Varma and
R. Ashish Bagchi

پہلا انگریزی ایڈیشن : 1993

پہلا اُردو ایڈیشن : مارچ 1999

تعداد اشاعت : 3000

© چلڈرن بک ٹرسٹ، نئی دہلی

قیمت : 35.00 روپے

This Urdu edition is published by the National Council for Promotion of Urdu Language, M/o Human Resource Development, Department of Education, Govt. of India West Block-I, R.K. Puram, New Delhi, by special arrangement with Children's Book Trust and Bachchon Ka Adabi Trust, New Delhi and printed at Indraprastha Press (CBT), New Delhi.

گوپال کرشن گوکھلے

پراوینا بھیم سین

"مجھے ہندوستان میں ایک سچے ذہن کی تلاش تھی، اور یہ رہنما مجھے گوکھلے کی شکل میں ملا۔ ان کے دل میں ہندوستان کی سچی محبت اور عقیدت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کی زندگی ملک کی خدمت کے لئے وقف تھی۔ جس کے لئے انہوں نے اپنی ساری خوشیاں اور مسرتیں نچھاور کر دیں۔

مہاتما گاندھی

گوپال کرشن گوکھلے

1895 میں انڈین نیشنل کانگریس کا گیارہواں اجلاس پونہ میں ہوا تھا جس کی صدارت سریندر ناتھ بینرجی نے کی تھی۔ وہ ہمارے ان رہنماؤں میں سے تھے جنھوں نے ہندوستان والوں کے دلوں میں قومی بیداری پیدا کی تھی۔ وہ ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے اور جادو بیان مقرر تھے۔ انھوں نے کانگریس کے اس اجلاس میں نمک کے ٹیکس میں کمی کرنے کی ایک تجویز پاس کرائی۔

روزمرہ کے استعمال کی اس اہم چیز نمک پر برطانوی حکومت کی اجارہ داری یا پورا کنٹرول تھا اور ہندوستان کے کسی بھی آدمی کے لئے نمک بنانا غیرقانونی تھا۔ برطانوی حکومت نے شروع ہی سے نمک پر ٹیکس لگا رکھا تھا جو سرکاری آمدنی کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ 1888 میں اس ٹیکس میں اور اضافہ کر دیا گیا تھا۔ جس کا غریبوں پر بہت بُرا اثر تھا۔

تجویز کی حمایت میں گوپال کرشن گوکھلے نے جو تقریر کی وہ دل کو چھو لینے والی تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں ہندوستان کے غریب عوام کی انتہائی غربت کی حالت کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا کہ کس طرح بھوکے، لاغر انسان صبح سویرے سے لے کر رات تک مشقت کرتے ہیں اور اس پر بھی انھیں دو وقت کی روٹی میسر نہیں ہوتی۔ یہ غربت کی چکی میں پسنے والے عوام اپنی آواز حکمرانوں کے ایوان تک نہیں پہنچا سکتے۔ اور ہر زیادتی کو اپنا

مقدر سمجھ کر جھیل جاتے ہیں۔

گوکھلے کے دل میں اپنے ملک کے لوگوں کے لئے جو درد تھ اور انسان کی عظمت کا جو احترام تھا اس کی گونج ان کی تقریر کے الفاظ میں صاف طور پر سنی جاسکتی تھی۔ لوگوں کے دکھ درد کو بانٹنے کے اسی جذبے کو لے کر انہوں نے اپنی پوری زندگی ملک کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔

ابتدائی زندگی

گوپال کرشن گوکھلے 9 مئی 1866 کو مہاراشٹر کے ایک غریب برہمن خاندان میں پیدا ہوئے ۔ مہاراشٹر کے ایک دور دراز کے کوٹلک گاؤں میں اپنے نانا کے گھر ان کی پیدائش ہوئی۔ یہ گاؤں اس زمانے کی بمبئی پریسیڈنسی (اب مہاراشٹر) کے رتناگری ضلع میں واقع ہے۔ قریب ہی ان کے باپ کرشنا راؤ کا گاؤں تمہن مالا تھا۔ تمہن مالا میں کرشنا راؤ کا ایک چھوٹا سا کھیت تھا۔ مگر وہاں کی زمین زرخیز نہیں تھی اس لئے سارا علاقہ کافی غریب تھا۔ کرشنا راؤ نے وہ علاقہ چھوڑ دیا اور کاگل میں آباد ہوگئے ۔ جہاں انہیں کلرک کی نوکری مل گئی تھی۔ اپنی ایمانداری اور خودداری کی وجہ سے اس علاقے میں ان کی بڑی عزت تھی۔

گوپال کی ماں والوبائی عرف ستیہ بھاما ایک سادہ مزاج اور دین دار عورت تھیں۔ انہوں نے بچوں میں خاندان سے محبت ، مذہبی طور طریقے اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا۔ گوپال کو اپنے ماں باپ کی یہ خوبیاں وراثت میں ملیں ۔

1879 میں کرشن راؤ کا انتقال ہوگیا۔انہوں نے اپنی بیوی، دو لڑکوں اور چار لڑکیوں کو بڑی غریبی کی حالت میں چھوڑا تھا ۔ اس وقت گوپال کی عمر 13 سال کی تھی۔ اپنے خاندان کے ایک ہمدرد وی۔ پی۔ دویدی کی مدد سے بڑے بھائی گوبند راؤ کو 15 روپے مہینہ کی ملازمت مل گئی ۔

گوپال کی 1880 میں شادی ہوگئی۔ ان کی بیوی ساوتری بائی ایک مہلک بیماری میں مبتلا تھیں۔ اور زیادہ دن زندہ نہ رہیں۔ اپنی ماں اور چچا اناجی کی ناراضگی سے بچنے کے لئے انہوں نے 1887 میں دوبارہ شادی کرلی۔ مگر ان کی دوسری بیوی بھی ایک بچے کی پیدائش کے موقع پر فوت ہوگئیں۔ وہ اپنی دو بیٹیاں چھوڑ گئیں۔

تعلیم

گوبند راؤ اور ان کی بیوی نے گوپال کی تعلیم کے لئے کافی قربانی دی۔ کولہاپور کے راجہ رام ہائی اسکول میں گوپال کی تعلیم کے لئے انہوں نے ہر مہینے 8 روپے کی رقم الگ کردی تھی۔

ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہی یہ ظاہر ہونے لگا تھا کہ گوپال میں ایمانداری اور خلوص کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ تعلیم میں بڑے بھائی ان کی جو مدد کر رہے تھے اس کا انہیں بہت پاس تھا۔ انہیں جو بھی رقم ملتی اس میں ہی وہ اپنا کام چلاتے اور کبھی زائد خرچ کی مانگ نہ کرتے۔ انہیں اکثر فاقہ کرنا پڑتا اور سڑک کی لالٹین کے نیچے پڑھنا پڑتا۔

اسکول میں گوکھلے کافی خاموش طبیعت کے لڑکے تھے۔ وہ بہت غیر معمولی طالب علم تو نہیں تھے مگر وہ بے حد محنتی اور حوصلہ مند ضرور تھے۔ ان کی یادداشت بہت تیز تھی۔ برطانوی مصنف اور سیاست داں ایڈمنڈ برک کا مقالہ "ریفلیکشن آن دی فرنچ ریولیوشن (فرانسیسی انقلاب پر تاثر) کے پیراگراف کے پیراگراف انہیں ازبر ہوگئے تھے جنہیں وہ صرف زبانی سنا ہی نہیں سکتے تھے، سمجھا بھی سکتے تھے۔ ایسا بھی بارہا ہوا کہ ان کے اسکول کے ساتھیوں سے ہر غلطی پر ایک ایک آنے کی شرط لگ گئی۔ لیکن وہ ہمیشہ بازی مارے گئے۔

1884 میں انہوں نے بمبئی کے الفنسٹن کالج سے گریجویشن کی ڈگری لی۔ آخری سال میں انہیں 20 روپیہ ماہانہ کا وظیفہ بھی ملنے لگا تھا۔

گوکھلے کی تعلیم نے ان کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ الفنسٹن کالج میں انگریزی کے پروفیسر ڈاکٹر ورڈس ورتھ نے انگریزی ادب اور شاعری کے مطالعے میں ان کی دلچسپی پیدا کی۔ ڈاکٹر ورڈس ورتھ انگریزی کے مشہور زمانہ شاعر ورڈس ورتھ کے پوتے تھے۔ انگریزی زبان و ادب پر گوکھلے کی بہت اچھی قابلیت ہوگئی۔ وہ انگریزی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار بہت فصاحت اور روانی سے کر سکتے تھے۔ ان کی اس خوبی نے انہیں جادو بیان مقرر اور بے مثال پارلیمنٹیرین بنا دیا۔

اس کالج میں ریاضی کے استاد پروفیسر ہاتھورن ویٹ نے ریاضی کے مضمون میں ان کی دلچسپی پیدا کی۔ اقتصادیات پر گوکھلے کو اچھی گرفت تھی۔ ریاضی کی مدد سے انہوں نے اس میں اور اچھی استعداد پیدا کی اور اعداد و شمار کا وہ موثر استعمال کرنے لگے۔

بے لوث استاد

گریجویشن کے بعد گوکھلے انڈین سول سروس میں شامل ہونا چاہتے تھے یا پھر انجینئر یا وکیل بننا چاہتے تھے، جو بہت منافع بخش پیشے تھے۔ پونہ کے ڈکن کالج میں ایک سال کے لئے انہوں نے قانون کے شعبے میں داخلہ لے لیا۔ مگر انہوں نے ان نفع بخش پیشوں میں جانے کا خیال چھوڑ دیا۔ اس وقت انہیں سب سے بڑی فکر اپنے بھائی کو مالی مدد پہنچانے کی تھی۔

1885 میں انہوں نے پونہ کے نیو انگلش اسکول میں 35 روپے ماہانہ پر اسسٹنٹ ماسٹر کی حیثیت سے ملازمت شروع کر دی۔ اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے انہوں نے پبلک سروس سرٹیفکیٹ امتحان دینے والوں کی کوچنگ بھی شروع کر دی۔ گوکھلے معلمی کے پیشے

میں جی جان سے جٹ گئے ۔ انھیں چوتھی اور پانچویں جماعت میں انگریزی اور ریاضی پڑھانے کا کام سونپا گیا ۔ وہ سبق پوری طرح تیار کرکے آتے ۔ وہ پورے کے پورے اقتباسات بالکل صحیح صحیح سنا سکتے تھے ۔ ایک درسی کتاب میں نیلسن کی زندگی پر رابرٹ سوتھلے کی ایک نظم شامل تھی ۔ اس میں بہت سی بحری اصطلاحیں دی گئی تھیں، جن سے طالب علم بالکل نامانوس تھے ۔ گوکھلے ہر ہفتے بمبئی بندرگاہ کی گودیوں میں جاتے اور جنگی جہازوں اور دوسرے جہازوں کے مختلف حصوں اور آلات کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ۔ انھوں نے یہ سبق اس شان سے پڑھایا جیسے وہ کوئی پیشہ ور جہاز راں ہوں۔ بچے ان کی بہت قدر اور ان سے بہت محبت کرتے تھے۔

اس زمانے میں ان کا ایک بڑا کارنامہ ریاضی کی ایک کتاب مرتب کرنا تھا۔ یہ کتاب انھوں نے اپنے ایک ساتھی این جی پنت کے تعاون سے تیار کی تھی۔ وہ ایک معیاری درسی کتاب بن گئی جس کا کئی ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔

ایک استاد کی حیثیت سے گوکھلے کی کامیابی پر دو ماہرین تعلیم کی نظر پڑی۔ یہ تھے بال گنگادھر تلک اور پروفیسر گوپال گنیش اگرکر۔ یہ چاہتے تھے کہ گوکھلے ڈکن ایجوکیشن سوسائٹی میں شامل ہوجائیں۔ یہ سوسائٹی 1884 میں بمبئی ہائی کورٹ کے جج مہادیو گوبند راناڈے کی تحریک پر قائم ہوئی تھی۔ اس سوسائٹی کا مقصد سماج کے غریب طبقے کے لئے اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھولنا تھا۔ اسی مقصد سے 1885 میں فرگوسن کالج قائم کیا گیا تھا۔ گوکھلے 1886 میں اس سوسائٹی کے مستقل ممبر بن گئے ۔ انھیں فرگوسن کالج میں 75 روپے مہینہ پر پڑھانے کے لئے بلایا گیا۔

گوکھلے نے اپنی زندگی کے 20 سال تک اس کالج کی خدمت کرنے کا عہد لیا۔ انھوں نے قانون کے اپنے ایک ساتھی طالب علم سے مذاق میں کہا تھا کہ "تم دولت کماؤگے اور گاڑیوں میں گھوموگے جبکہ میں نے ایک غریب پیدل راہ گیر بننے کا فیصلہ کر لیا

ہے۔" وہ ریاضی، انگریزی، اقتصادیات اور تاریخ اور انگلستان میں دستور کے ارتقاء کی تاریخ پڑھانے لگے ۔ ان سبھی مضامین میں انہیں ایک جیسی مہارت حاصل تھی ۔ انہیں اکثر ہمہ فن مولا کہا جاتا تھا ۔

عوامی زندگی

گوکھلے 20 سال کی عمر میں 1886 میں پہلی بار عوامی زندگی میں شریک ہوئے۔ انہوں نے کولہاپور میں اپنی پہلی تقریر کی جس کا عنوان تھا " انگریزی راج میں ہندوستان " ان کی خطابت کو بہت پسند کیا گیا ۔

" دکن ایجوکیشن سوسائٹی " میں انہوں نے ذمہ داریاں اٹھانے کا سلیقہ سیکھا۔ وہ ایک انگریزی ہفتہ وار " مہارٹا " میں برابر مضامین لکھتے رہے۔ یہ اخبار وشنوکرشن چپلونکر نے شروع کیا تھا۔ اور بعد میں تلک اور اگرکر نے اسے لے لیا تھا۔ ان لوگوں میں تعلیم کے ذریعہ لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کا حوصلہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ گوکھلے پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔ یہ بات ان کے دل میں بیٹھ گئی کہ تعلیم کے ذریعہ قوم کو متحد کیا جاسکتا ہے۔

1888 میں اگرکر نے ایک انگریزی ۔۔ مراٹھی ہفتہ وار " سدھارک " جاری کیا ۔ اس کا مقصد سماج سیوا کرنا تھا ۔ گوکھلے بھی اس اخبار کے ساتھ جٹ گئے اور اس کے انگریزی حصے میں برابر مضامین لکھتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ "سارو جنک سبھا" کے اعزازی سکریٹری اور اس کے سہ ماہی رسالے کے ایڈیٹر ہوگئے ۔ 1870 میں راناڈے نے یہ سبھا قائم کی تھی ۔ اس کا مقصد سرکار کے سامنے منظم شکل میں لوگوں کی شکایتیں اور مانگیں پیش کرنا تھا ۔

دکن ایجوکیشن سوسائٹی سے 1890 میں تلک کے استعفیٰ دینے کے بعد گوکھلے کی ذمہ

داریاں بڑھ گئیں۔ اگلے سال وہ سوسائٹی کے سکریٹری بنا دیئے گئے۔

گوکھلے نے ان اداروں کی جو بے لوث خدمت کی اس کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ 1893 میں انہیں بمبئی پروانشیل کانفرنس کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ دو سال بعد وہ بمبئی یونیورسٹی کی سینیٹ کے ممبر چن لئے گئے۔

1896 میں راناڈے نے ایک نئی تنظیم "دکن سبھا" شروع کی۔ اس کا مقصد بھی دکن ایجوکیشن سوسائٹی اور سارو جنک سبھا جیسا ہی تھا۔ اس سوسائٹی کی طرف سے حکومت کو، انتظامی امور، طاعون سے چھٹکارا، لوکل سیلف گورنمنٹ، اصلاح آراضی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر عرض داشت پیش کر کے اصلاحی کارروائی کرنے کی مانگ کی گئی تھی۔ گوکھلے نے اپنے آرام کا سارا وقت ان کاموں میں لگا دیئے۔

دن بدن ان کی ذمہ داریاں بڑھتی گئیں۔ 1898 سے 1906 تک وہ پونہ میونسپلٹی کے ممبر رہے۔ دو بار وہ اس کے صدر بھی رہے۔ لوگ اپنی شکایتیں لے کر بڑی آسانی سے ان تک پہنچ سکتے تھے۔ پانی کی سپلائی اور پانی کی نکاسی جیسے معاملوں کا مسئلہ وہ عملی قدم اٹھا کر سلجھایا کرتے تھے۔ اس حوصلہ مند سماج سدھارک گوکھلے نے پونہ سے اپنا ایک روزنامہ "گیان پرکاش" بھی جاری کیا۔ سیاسی اور سماجی اصلاح پر اپنے خیالات کی تبلیغ و اشاعت وہ اس کے ذریعہ کرتے تھے۔

سرونٹس آف انڈیا

گوکھلے میں غریبوں کی زندگی کو اونچا اٹھانے کا جذبہ ہمیشہ سے کار فرما رہا تھا۔ 1905 میں انھوں نے "سرونٹس آف انڈیا" سوسائٹی قائم کی۔ یہ سوسائٹی ایسے حوصلہ مند اور بے لوث نوجوانوں کی تربیت کرتی تھی جو سماج سدھار کا کام کرنے کو تیار ہوں۔ ان میں زیادہ تر یونیورسٹیوں کے گریجویٹ ہوا کرتے تھے۔ انہیں اپنے زمانے کے مسئلوں سے

آگاہ کیا جاتا تھا اور دستوری طریقے سے بدیسی حکومت کے خلاف لڑائی لڑنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ ان تربیت پانے والوں کو سادہ، پرخلوص اور ایک لگن کے ساتھ زندگی گزارنے کا عہد لینا پڑتا تھا۔

گوکھلے کی رہنمائی میں سوسائٹی کے ممبروں نے قبائلیوں (آدی واسیوں) کی خدمت کے نمایاں کام انجام دیئے۔ سیلاب اور قحط سے متاثر لوگوں کی مدد کرنے اور عورتوں کی تعلیم کے میدان میں نمایاں کام انجام دیئے۔

گوکھلے کا اپنے کارکنوں پر جو اثر تھا، اسے دیکھتے ہوئے اکثر مذاق میں لوگ کہتے تھے کہ ہمیں "ہلائے رکھنے کے لئے تو ایک ہی گوکھلے کافی ہے۔ مگر جب ان جیسے بہت سے گوکھلے جو تیار ہورہے ہیں، میدان میں ہوں گے تو ہمارا کیا حال ہوگا ؟"

گوکھلے کی زندگی پر شروع میں ہی اس زمانے کی اہم شخصیات کا اثر پڑا جنہوں نے ان کی زندگی کو اس رنگ میں ڈھال دیا۔

دادا بھائی نوروجی ہندوستان کی اقتصادی مسائل سے بہت فکرمند تھے۔ ملک کے مالی وسائل کی نکاس سے یہ مسئلہ پیدا ہورہا تھا۔ گوکھلے نے اس موضوع کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کی ٹھان لی۔ نوروجی کے کھلے دل اور دماغ کے رویئے نے انہیں بہت متاثر کیا۔

ممتاز قانون داں اور جانے مانے رہنما فیروز شاہ مہتہ کی پروقار زندگی میں انہیں خاص کشش نظر آئی۔

سرکردہ وکیل اور انگریزی حکومت کے نڈر نکتہ چینی کرنے والے سر دنشا ایڈل جی واچا کی شخصیت ان کے لئے بڑے بھائی جیسی تھی جن سے انہیں اچھے مشورے اور رہنمائی ملتی رہتی تھی۔

پارلیمنٹ کے ممبر سر ولیم ویڈربرن نے انہیں لبرل خیالات سے روشناس کیا۔ ان کی ہی مدد سے گوکھلے انگلینڈ میں ہندوستان کے مسائل بے خوف ہوکر اٹھانے لگے۔

مگر گوکھلے کی زندگی پر سب سے گہری چھاپ مہادیو گووند ناڈے کی پڑی تھی۔ جن کی رہنمائی میں انہوں نے 1887 میں کام شروع کیا تھا۔ انہوں نے 15 سال تک عوامی زندگی کے سبھی پہلوؤں کی انہیں تربیت دی۔ عوامی خدمت میں خلوص اور حوصلہ مندی برتتے کا سبق انہیں پڑھایا۔ 1901 میں راناڈے کا انتقال ہونے پر گوکھلے اپنے کو یتیم محسوس کرنے لگے۔ انہوں نے گوکھلے کو ایک رومال (اسکارف) دیا تھا، جسے وہ زندگی بھر کافی عزیز رکھتے تھے۔ گیارہ سال بعد جنوبی افریقہ کے سفر کے دوران گوکھلے کو جونسبرگ میں ایک دعوت میں شریک ہونا تھا۔ دعوت میں جانے کے لئے اس رومال پر استری کرنے کی ضرورت تھی، گاندھی جی نے اس میں مدد دینے کی پیشکش کی۔ گوکھلے نے اس پر گاندھی جی سے کہا کہ "ایک وکیل کی حیثیت سے تو میں آپ پر اعتبار کر سکتا ہوں۔ مگر ایک دھوبی کی حیثیت میں نہیں۔ اگر تم نے اس رومال کو خراب کر دیا تو جانتے ہو کیا ہوگا۔ تمہیں نہیں معلوم ہے کہ مجھے یہ رومال کتنا عزیز ہے۔" گاندھی جی بھی اپنی دھن کے پکے تھے، چنانچہ انہوں نے دکھا دیا کہ ایک دھوبی کی حیثیت میں بھی ان پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔

سیاسی گرو

گاندھی جی 1896 میں جنوبی افریقہ سے ہندوستان آئے تاکہ یہاں سے وہ جنوبی افریقہ میں شروع کی ہوئی نسلی امتیاز کے خلاف جنگ میں کچھ مدد حاصل کر سکیں۔ جب وہ گوکھلے سے ملے تو ان کے چہرے مہرے اور نیک سیرت سے بہت متاثر ہوئے۔ گاندھی جی نے اسی وقت انہیں اپنا سیاسی گرو تسلیم کر لیا۔ گوکھلے کی شخصیت انہیں "گنگا" جیسی لگی جو ہر کسی کو اپنی آغوش میں بلاتی ہے۔ اور جس میں کشتی اور پتوار لے کر نکلنا کافی فرحت بخش ہوتا ہے۔

گاندھی جی کے سادہ طور طریقے اور ڈھکوسلوں سے پاک عادتوں سے گوکھلے بھی متاثر ہوئے اور ان کے ساتھ بڑے بھائی کی طرح بہت محبت اور مہربانی کا سلوک کرنے لگے۔

گاندھی جی نے گوکھلے سے سوراج حاصل کرنے کے لئے پرامن منظم اور قانونی طور طریقے اپنانے کے گر سیکھے۔ گوکھلے کے نزدیک سوراج کا مفہوم تھا "برطانوی کامن ویلتھ کے اندر رہتے ہوئے ہندوستان کے لئے سیاسی برابری اور خود اپنی حکومت کا حق حاصل کرنا۔" انہیں آزادی، حریت پسند اور حق پرست انگریز قوم کی دیانت داری پر پورا بھروسہ تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ انگریز قوم میں بہتر سوچ رکھنے والوں کے تعاون سے ہندوستان اپنی منزل پاسکے گا۔

کانگریس میں

گوکھلے 1889 میں کانگریس میں شامل ہوئے۔ کانگریس کے پلیٹ فارم سے انہوں نے پرزور آواز اٹھائی۔ ان کا مقصد واضح اور ان کی باتیں دلائل سے بھری ہوئی تھیں۔ انہوں نے عوام کے اندرونی جذبات اور حوصلے کی بھرپور ترجمانی کی۔

1889 میں کانگریس کا اجلاس بمبئی میں ہوا تھا جس میں گوکھلے نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے حکومت کو اس بات کے لئے آڑے ہاتھوں لیا کہ وہ انڈین سول سروس کے امتحانات انگلینڈ کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں کرانے کا بندوبست کیوں نہیں کرتی۔ یہ اس سے پہلے کیے گئے وعدے کی سراسر خلاف ورزی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ کسی ہندوستانی کی ترقی کے راستے میں رنگ، نسل اور فرقے کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں برتی جائے گی۔ گوکھلے نے کہا کہ "انگلینڈ نے یا تو دیانتداری سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا یا اب اسے ہم سے کئے گئے وعدے کا پاس نہیں رہ گیا ہے۔" گوکھلے کو بہت سی تجاویز پر بولنے کے لئے بلایا گیا۔

1905 میں گوکھلے کو لالہ لاجپت رائے کے ساتھ کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے انگلینڈ بھی جانا پڑا۔ انہیں انگریز سیاست دانوں اور انگریز عوام کے سامنے ہندوستان کے حالات کی صحیح تصویر پیش کرنا تھی۔ اپنے 49 دن کے قیام کے دوران گوکھلے نے مختلف شہروں میں 45 تقریریں کیں۔ جن میں انہوں نے ہندوستان کا سچا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔ ان کی جادو بیانی نے لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ یقیناً گوکھلے ہندوستان کی آواز بن گئے۔

ویلبی کمیشن

دادا بھائی نوروجی اس بات پر زور دیتے رہے تھے کہ ہندوستان کی معاشی حالات کی جانچ کے لیے کوئی کمیشن مقرر کیا جائے۔ ملک کا انتظام چلانے، فوجی اور غیر فوجی اخراجات کے لئے جو ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اس سے لوگوں کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ مئی 1896 میں لارڈ ویلبی کی سربراہی میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا، اس لئے اسے "ویلبی کمیشن" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کمیشن نے 1897 میں انگلینڈ میں اپنا کام شروع کیا۔ ہندوستان کی تین پریسیڈنسی کلکتہ، بمبئی اور مدراس سے تین نمائندے سرہندر ناتھ بنرجی، ڈی۔ ای۔ واچا اور جی ایس آیر بھیجے گئے۔ پونہ اس وقت دانشوروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جس کی خاص سیاسی حیثیت بھی تھی۔ گوکھلے کو دکن سبھا کا نمائندہ نامزد کیا گیا۔

گوکھلے کا یہ انگلینڈ کا پہلا سفر تھا۔ انہوں نے کمیشن کے سامنے حقائق اور شواہد پیش کئے اور اپنے سے دوگنی عمر اور تجربہ رکھنے والے لوگوں کے تیکھے سوالوں کا سامنا کیا۔ جتنے بھی سوالات وہاں اٹھائے گئے گوکھلے نے سبھی کے مدلل جواب دیے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی تعلیم یافتہ ہندوستانی معلم کی طرف سے اتنی واضح اور ماہرانہ طریقے سے بات اس سے پہلے کبھی نہیں رکھی گئی تھی۔

معاشی امور پر ان کی اتنی اچھی پکڑ نے سبھی کو حیرت میں ڈال دیا۔ برطانوی

حکومت کے قائم ہونے کے بعد سے ہندوستان میں جو سیاسی اور سماجی زوال آیا تھا گوکھلے نے اعداد و شمار پیش کرکے اپنی دلیلوں سے لوگوں کو قائل کر دیا۔ انہیں اس سے انکار نہیں تھا کہ ریلوے کی ترقی سے ہندوستان کو فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ یقیناً اس کی وجہ سے اب دور دراز کے علاقوں تک پہنچنا ممکن ہوگیا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ریلوے نے مغربی ملکوں کی فیکٹریوں کا سستا مال ان علاقوں میں پہنچایا ہے اور ہندوستان کے سستے خام مال کی ڈھلائی کرکے جہاز کے ذریعہ مغربی ملکوں کے کارخانوں کو پہنچایا بھی ہے۔ اس سے ہندوستان پر دوطرفہ مار پڑی ہے۔ اس سے ہندوستان کی گھریلو صنعتیں برباد ہوئی ہیں اور ہندوستانی دستکار بیکار ہوئے ہیں۔

گوکھلے کی اس کے لئے بہت تعریف کی گئی مگر انہوں نے بہت انکساری سے اس کا سہرا اپنے دو استادوں کے سر باندھ دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ سب کچھ راناڈے اور ان کے ایک ہیڈ ماسٹر جی۔ وی۔ جوشی کی دین ہے جنہوں نے انہیں تیار کیا تھا۔

معافی کا واقعہ

اسے ستم ظریفی ہی کہا جائے گا کہ ان کے اس کارنامے پر ایک واقعہ کا سیاہ سایہ بھی پڑا اسے معافی کا واقعہ کہتے ہیں۔

ویلبی کمیشن کے سلسلے میں جب گوکھلے 1897 میں انگلستان میں تھے تو بمبئی پریسیڈنسی میں طاعون کی وبا پھیل گئی۔ پونہ اس وبا سے سب سے زیادہ متاثر تھا۔ طاعون ریلیف کمیٹی میں کام کرنے والے برطانوی فوجیوں نے اپنے کام میں لوگوں کے مذہبی جذبات اور سماجی احساسات کا خیال نہیں رکھا۔ اس بیماری پر قابو پانے کے لئے انہوں نے سخت تدبیریں اختیار کیں۔ بیماری کے دفاع کے لئے بوڑھے مردوں عورتوں کے کپڑے پھاڑنے لگے۔ ان احتیاطی تدبیروں میں انہوں نے پوجا کی مورتیوں کو بھی سڑکوں پر

پھینک دیا اور لوگوں کی ملکیتوں کو بھی بے دردی سے نقصان پہنچایا۔

لوگ اس سے بہت برہم ہوئے۔ لوگوں نے غصہ میں آکر طاعون ریلیف کمیٹی کے صدر مسٹر رانڈ اور لیفٹننٹ کرنل آیرسٹ کو قتل کر دیا۔ یہ دونوں پونے کے گورنمنٹ ہاؤس سے ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی تقریبات میں شرکت کرکے لوٹ رہے تھے۔

ہندوستان میں گوکھلے کے کچھ قابل اعتماد اور ذمہ دار دوست خط لکھ لکھ کر انہیں برابر صورت حال سے آگاہ رکھ رہے تھے۔ "سدھارک" "کیسری" اور "مراٹھا" میں بھی اس کی خبریں چھپ رہی تھیں۔

گوکھلے کو اس سے کافی تکلیف پہنچ رہی تھی۔ وہ متاثر لوگوں کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ سر ویڈربرن کی ذریعے سے انہوں نے برطانوی پارلیمنٹ کے سرکردہ کچھ ممبروں سے ملاقات کی اور انہیں لوگوں پر ڈھائے جارہے ظلم و ستم کی جانکاری دی۔ انہوں نے اس سلسلے میں مانچسٹر گارجین کے ایک نمائندے کو انٹرویو بھی دیا۔

بمبئی کے گورنر لارڈ سینڈ ہرسٹ نے بلا تاخیر انگلستان کی حکومت کو مطلع کیا کہ ظلم اور زیادتی کی ساری باتیں غلط ہیں اور بدخواہوں کی پھیلائی ہوئی ہیں۔

گوکھلے بہت مایوس ہوکر ہندوستان لوٹے۔ ان کے بہی خواہوں میں دادا بھائی نوروجی سر ویڈر برن اے۔ او۔ ہیوم، سریندر ناتھ بینرجی اور بہت سے دوسرے لوگ شامل تھے جو گوکھلے کے خلوص اور سچائی کے قائل تھے۔ یہ سب بہی خواہ پوری طرح گوکھلے کے ساتھ رہے اور اس میں ہر طرح سے ان کی مدد کی۔ راناڈے اور فیروز شاہ مہتہ نے گوکھلے کو صلاح دی کہ اس سے ذہنی چھٹکارا پانے کے لئے انہیں معافی مانگ لینی چاہئے۔ گوکھلے نے ایسا ہی کیا۔

1898 میں پھر طاعون پھیلنے پر انہوں نے نوجوان رضاکاروں کو ساتھ لے کر کام شروع کیا۔ اگلے سال انہوں نے طاعون ریلیف کمیٹی کا ممبر بنالیا گیا۔

1899 میں گوکھلے دو سال کے لئے بمبئی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوگئے۔ بمبئی لگاتار طاعون اور قحط سے متاثر رہا تھا۔ انہوں نے قحط سے نجات کے ضابطوں کی غیر تسلی بخش کارروائی کے خلاف آواز اٹھائی۔ ریلیف کا کام ٹھیک ڈھنگ سے نہیں چل رہا تھا۔ ان کی دلیل تھی کہ حکومت کو قحط زدہ علاقوں میں چھوٹی صنعتیں شروع کرنی چاہئیں۔

کسان دن بدن بڑھتے ہوئے قرضوں سے دبا ہوا تھا۔ قرض اس کا علاج نہیں تھا۔ یہ تو بیماری سے بھی بدتر تھا۔ ان کی تجویز تھی کہ کوآپریٹیو سوسائٹیاں قائم کرکے کسانوں کو قرض کے بوجھ سے نجات دلائی جائے۔ حکومت نے بہت بعد میں اس بات کو منظور کیا۔

فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم کرنے میں بھی انہوں نے اہم رول ادا کیا۔ مختلف فرقوں کے علاحدہ حق ارادیت کی انہوں نے جم کر مخالفت کی۔ انہوں نے نشہ آور چیزوں کی خرید و فروخت پر پابندی لگانے کی حکومت سے مانگ کی۔ جس سے حکومت کو آمدنی ہوتی ہے مگر برائیاں پھیلتی ہیں۔

1902 میں گوکھلے فرگوسن کالج سے سبکدوش ہوگئے۔ مگر ان کے لئے ابھی بہت سارا کام باقی تھا۔ وہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر چن لئے گئے۔ یہ سیٹ فیروز شاہ مہتہ کی رکنیت کی مدت پوری ہونے پر خالی ہوئی تھی۔ کونسل میں انہوں نے اپنے کام کا آغاز بجٹ پر بحث سے شروع کیا۔ بجٹ پر ان کی تقریر ایک تاریخی دستاویز بن گئی جس کی بہت تعریف ہوئی۔

وہ ہر مرحلے پر حکومت پر زور دیتے رہے کہ سرکاری ملازمتوں میں زیادہ سے زیادہ ہندوستانیوں کو رکھا جائے، فوجی خرچ کم کیا جائے، نمک ٹیکس معاف کیا جائے، آبپاشی کی سہولتیں بڑھائی جائیں، سائنس اور زرعی تعلیم کو فروغ دیا جائے۔ قحط ریلیف کے فنڈ کو معقول طریقے سے خرچ کیا جائے اور مقامی انتظام کے لئے جمہوری ادارے قائم کئے جائیں۔

1904 کے یونیورسٹی قانون کی انہوں نے بھرپور تنقید کی کیونکہ اس میں تعلیم کے میدان میں ہندوستانیوں کو شامل کرنے کی بجائے انہیں دور کیا جارہا تھا۔ مفت ابتدائی تعلیم کو لازمی بنانے کے لئے 1911 میں انہوں نے ایک بل رکھا یہ ایک بڑا کارنامہ تھا۔ افسر شاہی کی سرد مہری کی وجہ سے یہ بل پاس نہیں ہوسکا۔

ان کا کہنا تھا کہ عوام اور حکومت کے درمیان بڑھتی ہوئی دوری کے لئے خود حکومت ذمہ دار ہے۔ ان کی دلیل تھی کہ 1907 کا " باغیانہ میٹنگ قانون " 1889 کا " آفیشیل سیکریٹ قانون " اور 1910 کا " پریس بل " ان سب کے ذریعہ عوام کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ایسے قانونوں کے پاس ہونے سے عوام اور حکومت کے بیچ دوری بڑھی ہے وہ ان سب کی مخالفت کرتے رہے۔

امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں ان کی کارکردگی نہایت اعلی درجہ کی تھی۔ ہندوستان کے وائسرائے (1890۔ 1905) لارڈ کرزن کا کہنا تھا کہ " اتنے مضبوط ارادے کے کم آدمیوں سے وہ ملے ہیں۔ ان کے ساتھ دلیل اور بحث مباحثہ کا اپنا الگ ہی مزہ ہے۔ "

گوکھلے کو سب سے بڑا اعزاز 1905 میں اس وقت ملا جب وہ ہندوستان کے معاملوں کی وکالت کرنے انگلستان گئے ہوئے تھے۔ انہیں بنارس میں ہونے والے کانگریس کے اجلاس کا صدر چن لیا گیا تھا۔

لارڈ کرزن نے بنگال کی تقسیم کا منصوبہ پاس کر دیا تھا، جس کی کافی مخالفت ہوئی تھی۔ کانگریس کے گرم لیڈروں کا رویہ بھی بہت سخت ہوگیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کانگریس برطانوی سامان کے بائیکاٹ جیسی اہم تجویز پاس کرے۔

اس معاملے پر کانگریس بٹ گئی تھی۔ گوکھلے نے پہلے کی طرح خاموش حکمت عملی کا رویہ اختیار کیا۔ بنارس کا اجلاس باہمی مفاہمت کے ماحول میں بخیر و خوبی انجام پاگیا۔ کانگریس کو دستوری حکمت عملی کا پابند بنائے رکھنے میں گوکھلے کامیاب رہے۔

نرم اور گرم دل

شدت پسند طبقہ یا گرم دل سودیشی کے معاملے میں کانگریس کے رویئے اور آزادی حاصل کرنے کے طور طریقوں سے غیر مطمئن رہا۔ 1906 میں کانگریس کا اجلاس کلکتہ میں دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں "سوراج" یا "خود اختیاری حکومت" کو ہندوستان کا نصب العین قرار دیا گیا۔ اس سے کم کوئی بات منظور نہیں تھی۔

گوکھلے کی رہنمائی میں کانگریس کے نرم دل نے سوراج کو نصب العین تو مان لیا مگر یہ سوراج دستوری طریقے اپنا کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے انتہاپسندی کی بجائے بتدریج اصلاح پر زور دیا۔ 1907 میں کانگریس کا اجلاس سورت میں ہوا، جس میں صدر کے معاملے کو لے کر اختلافات ابھرے۔ گوکھلے کی رہنمائی میں نرم دل والوں کو غلبہ حاصل تھا اور ان کے نمائندے ڈاکٹر راس بہاری گھوش کا نام سامنے آیا۔ ڈاکٹر گھوس عوام میں مقبول تھے۔ وہ بنگال میں قومی تعلیمی اداروں کے قیام کے لئے کافی دولت دے چکے تھے۔ گرم دل والوں کو اس پر اتفاق نہیں تھا۔ اجلاس کے دن کافی اشتعال پھیل گیا اور اجلاس میں افراتفری مچ گئی۔ دونوں نے اس دن اپنی الگ الگ بیٹھک کی۔ گوکھلے کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ 1907 میں ان کے بڑے بھائی کے انتقال کے بعد ان پر خاندان کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی تھیں۔

مگر گوکھلے تن تنہا کانگریس کو پھر سے صحت مند بنانے کے کام میں جٹے رہے۔ انہوں نے کانگریس کے لئے ایک نئے دستور کا مسودہ تیار کیا۔ انتہا پسند یا گرم دل کے لیڈروں کی رضامندی سے انتخاب کا ایک نیا طریقہ کار وضع کیا گیا۔ مگر دونوں کے درمیان کوئی صلح مشکل ہوگئی۔ انتہاپسندوں کے پاس کوئی رہنما نہیں رہ گیا تھا۔ تلک جیل میں تھے اور 1908 میں انہیں ملک بدر کرکے برما بھیج دیا گیا تھا۔ لالہ لاجپت رائے نے امریکہ میں پناہ لے لی تھی۔ بپن چندر پال کو چھ مہینے جیل کی سزا ہوگئی تھی۔ جس کے بعد کچھ

سال کے لئے وہ لندن میں مقیم ہوگئے تھے۔ آربندو گھوش پانڈیچری میں دن گزار رہے تھے۔ سورت میں پارٹی کے دو ٹکڑے ہوجانے کے بعد کانگریس پر تو نرم دل والوں کا غلبہ بن گیا، مگر عوام میں ان کی مقبولیت گھٹ گئی۔ یہیں سے ہندوستان کی سیاست میں نرم پنتھی سیاست کا خاتمہ ہونا شروع ہوجاتا ہے۔

اصلاحات

گوکھلے نے دستوری سدھار کی سمت میں نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ یہ اصلاحات 1909 کی "منٹو۔ مارلے اصلاحات" کے نام سے مشہور ہیں۔ اس وقت کے گورنر لارڈ منٹو اور ہندوستانی معاملوں کے برطانوی وزیر لارڈ مارلے کے نام سے یہ اصلاحات مشہور ہوئیں۔

1909 میں ان اصلاحات کو قانونی شکل مل گئی۔ یہ اصلاحات بہت مایوس کن تھیں۔ ان میں لوگوں کو سچا جمہوری نظام نہیں دیا گیا تھا۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا گوکھلے کا سپنا بھی اس سے چور چور ہوگیا۔ انہیں اس بات سے بہت مایوسی ہوئی کہ انتخابات میں مسلمانوں کو جداگانہ حیثیت دی گئی تھی۔ مگر اصلاحات کے لئے گوکھلے نے برسوں جو جدوجہد کی تھی اس کا کچھ نہ کچھ صلہ ضرور مل گیا تھا۔ ہندوستان والوں کو حکمرانی کی اعلیٰ سطح پر کچھ حصہ داری مل گئی تھی۔ عوامی امور کے معاملات کے فیصلوں میں اب باصلاحیت ہندوستانیوں کو اپنی بات رکھنے کا کچھ موقع دیا گیا تھا۔ گورنر جنرل کی ایگزیکٹیو کونسل میں ایک سیٹ ہندوستانیوں کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی۔ شری ایس پی سنہا (جو بعد میں رائے پور کے لارڈ سنہا کی حیثیت سے مشہور ہوئے) یہ اعزاز حاصل کرنے والے پہلے ہندوستانی تھے۔ ہندوستانی نمائندے کو عوامی مفاد کے معاملات میں تجویز پیش کرنے کا اختیار بھی دیا گیا تھا۔

خود اختیاری حکومت کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔

جنوبی افریقہ میں

گوکھلے کو جنوبی افریقہ میں رہنے والے ہندوستانیوں سے کافی ہمدردی تھی۔ وہاں ہندوستانیوں پر جو ظلم ڈھایا جارہا تھا اسے وہ اپنے خلاف ظلم تصور کرتے تھے۔

گاندھی جی کے بلاوے پر وہ 1912 میں جنوبی افریقہ گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب کوئی ہندوستانی لیڈر ہندوستان کے باہر ایسے ملک میں گیا تھا جہاں ہندوستانی لوگ ہجرت کر کے گئے تھے۔ ان کا مقصد ہندوستان کے لوگوں کی حالت کا جائزہ لینا تھا۔

گوکھلے نومبر 1912 میں ہندوستان واپس آگئے۔ جنوبی افریقہ کی حکومت نے جلدی وہ وعدے بھلا دیئے جو اس نے گوکھلے سے کیے تھے۔ وہاں نسلی امتیاز اپنی ساری وحشت گردی کے ساتھ جاری رہا۔

گاندھی جی اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔

گوکھلے گاندھی جی کی حوصلہ مندانہ کارروائی سے بہت متاثر تھے اور انہوں نے مختلف ذرائع سے رقم جمع کرکے ان کی مدد بھی کی۔

1914 میں وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے گوکھلے کی نمایاں کارناموں کے لئے نائٹ کمانڈر (KCIE) کا خطاب دلانے کی تجویز رکھی جسے گوکھلے نے بہت نرمی سے نامنظور کر دیا۔

1912 میں حکومت نے ایک شاہی کمیشن مقرر کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ہندوستان میں سول سروس کی جانچ کے لئے مقرر کئے گئے اس کمیشن میں آٹھ یوروپی اور تین ہندوستانی ممبر تھے۔ گوکھلے بھی ان میں شامل تھے۔ اس کمیشن نے اپنا کام دسمبر 1912 سے شروع کیا اور ہندوستان کے سارے بڑے شہروں میں گواہیاں لینے گیا۔ پھر 1913 میں انگلینڈ گیا۔ گوکھلے اس سلسلے میں وہاں چار مہینے رہے۔

انہوں نے بہت صبر و سکون اور ماہرانہ چابکدستی سے گواہوں کے ساتھ جرح کر کے ان کی جھوٹی شان اور تعصبات کا پردہ فاش کیا۔ انہوں نے سول سروس میں کم سے کم 35 سے 40 فیصد تک ہندوستانیوں کو نمائندگی دینے کی مانگ کی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ امپیریل اور صوبہ جاتی سروسز میں ہندوستانیوں کو زیادہ سے زیادہ نمائندگی ملنی چاہئے۔

مگر کمیشن کی رپورٹ آنے تک گوکھلے زندہ نہیں رہے۔ کمیشن کی رپورٹ اگست 1915 میں ملی۔ برسہا برس کی ان تھک محنت سے ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔

موت

تھکان کی وجہ سے ان کی شکر کی بیماری (ذیابیطس) زور پکڑ گئی۔ سانس پھولنے اور دمے کی شکایت رہنے لگی۔ موت سے دو دن پہلے انہوں نے دستوری اصلاح کی اسکیم کے مسودے کو آخری شکل دی تھی۔ بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگڈن کی فرمائش پر یہ اسکیم تیار کی گئی تھی۔ اس مسودے میں ہندوستانیوں کو بہت سی مختلف مراعات دینے کی بات کہی گئی تھی اس طرح کی باتیں 1919 کی مانٹیگو، چیمسفورڈ اصلاحات میں بھی سامنے آئیں۔

19 فروری 1915 کو رات سوا دس بجے انہوں نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ انہوں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور پھر ہاتھوں کو جوڑ لیا۔ اس عظیم رہنما کا یہی آخری لمحہ تھا۔

"وہ طبیعت سے منکسر مزاج اور عالی ظرف ہیں۔ مدمقابل کے جذبات کا ہمیشہ پاس رکھتے اور کڑائی سے حملہ کرنے پر بھی وہ مشکل سے ہی دوسرے کے جذبات کو مجروح کرتے ہیں۔ سیاسی فکر کے اعتبار سے ان کی پہچان ایک اعتدال پسند کی ہے مگر وہ کسی پارٹی کے آدمی نہیں لگتے۔ متنازع باتوں سے دور رہ کر ان کو سب سے بڑی فکر حب الوطنی کی ڈور میں سبھی پارٹیوں کو ایک ساتھ باندھے رکھنے کی ہے۔ وہ ایسے مکتب فکر کے پروردہ تھے جہاں خود اپنا حساب کتاب کرتے رہنا سب سے بڑی کسوٹی ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ فریب کاری اور بے جا طرف داری سے دامن بچائے رہے ہیں۔ اپنے ملک والوں سے انہیں بے حد پیار ہے ۔ وطن کے لوگوں سے ان کی اس خالص محبت پر کوئی اور چیز اثر انداز نہیں ہوتی ۔ ان کے قول ، اور خیالات نہایت نیک ہیں وہ جادو بیان مقرر ہیں، جو اشتعال دیئے بغیر لوگوں میں ولولہ پیدا کرنے پر قادر ہیں۔ وہ اس ملک کے ایسے سپوت ہیں جو آپسی علیحدگی سے ڈرتے نہیں بلکہ سبھی میں صلح و صفائی برقرار رکھنے کے جذبے سے سرشار ہیں۔ وہ ایک ایسے رضاکار ہیں جو حکم بجا لانے اور حکم دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ ترقی کے راستے کے سپاہی ہیں جو اپنے مقصد پر پختہ ایمان رکھتا ہے۔ مسٹر گوکھلے سچے معنی میں ہندوستان کے خدمت گار ہیں۔"

مہاتما گاندھی

وی، ایس، سری نواسا ساستری

شانتا راما سوامی

و

کے۔ ایس۔ سری نواس

"تہذیب، تمدن، علم، نیکی اور روحانی سکون کی طرح آزادی بھی ایک ایسا پودا ہے جس کی جتنی آبیاری کی جاتی ہے اتنا ہی یہ پھلتا پھولتا ہے اور عوام کی طرف سے جتنی دیکھ ریکھ اور توانائی اس میں شامل کی جاتی ہے، اتنی ہی ان کی اپنی زندگی میں یہ خوبصورتی عظمت اور شان وشوکت عطا کرتی ہے۔ وہ جو آزادی کو کچھ علاقوں یا کچھ مخصوص لوگوں کے لیے محدود کرتا ہے وہ جانتا ہی نہیں ہے کہ وہ کیا کررہا ہے چونکہ اس عمل سے انسانیت کو اس کے وقار اور زرخیزی سے محروم کررہا ہے، میں تو آزادی کو خدا کی وہ منشا اور وہ دین سمجھتا ہوں جسے پروان چڑھانے کے لیے ہر نسل اور ہر قوم کو اپنے اپنے وقت پر اپنی کوششوں کو شامل کرتے رہنا چاہیے۔"

وی۔ ایس۔ سری نواسا ساستری

وی۔ ایس۔ سری نواسا ساستری

1857 میں ہندوستانیوں نے ایک انقلاب برپا کیا تھا۔ انگریزوں کے خلاف یہ بغاوت اگرچہ دبا دی گئی تھی مگر اس سے انگریزی حکومت کی طرف ہندوستان والوں کی سوچ میں ایک انقلابی تبدیلی آگئی تھی۔

اس تبدیلی کا ایک اچھا نمونہ ہمیں وی۔ ایس۔ سری نواس ساستری کی شخصیت میں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ وہ جنوبی ہندوستان کے تنجاور ضلع کے کمبا کونم کے نزدیک ایک چھوٹے سے گاؤں والنگیمن میں 22 ستمبر 1869 کو پیدا ہوئے۔

ساستری کے والد ایک پجاری تھے۔ ان کی کوئی بندھی ٹکی آمدنی نہیں تھی۔ پوجا پاٹ کرانے انہیں دور دور ججمانوں کے گھر جانا پڑتا تھا۔ ان کی ماں بہت مذہبی خیال کی تھیں، وہ انہیں پرانوں کے قصے سنایا کرتی تھیں ساستری کو انہیں قصے کہانیوں سے مذہبی باتوں کی شدبد ہوئی، وہ مذہبی ماحول میں پلے بڑھے۔

ساستری کو روزانہ چھ میل پیدل چل کر اسکول جانا پڑتا تھا، یہ اسکول کمبا کونم میں تھا۔ جو بچے پیسہ خرچ کر سکتے تھے وہ ایک آنہ دے کر بیل گاڑی میں اسکول جاتے۔ مگر یہ ایک آنہ ان کو میسر نہیں تھا۔ اس اسکول میں انہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ کھیل کود میں انہیں گولیاں کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اس کھیل میں وہ زیادہ تر جیت جایا

کرتے تھے۔ اس سلسلے میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ اکثر ان کی توتو میں میں بھی ہوجاتی مگر ساستری طبیعت سے بہت امن پسند تھے، وہ اس طرح کے ٹکراؤ سے بچتے اور جیسے ہی بات آگے بڑھتی وہ معافی مانگ کر الگ ہوجاتے۔

1884 میں انہوں نے میٹرک پاس کیا اس وقت وہ 15 سال کے تھے۔ ان کے ماں باپ انہیں کالج کی تعلیم کے لئے بھیجنے کی حالت میں نہیں تھے مگر خوش قسمتی سے اس وقت مدراس پریسیڈنسی میں ایسا انتظام تھا کہ میٹرک میں اکیسویں پوزیشن تک حاصل کرنے والے لڑکوں کی کالج میں ٹیوشن فیس معاف کر دی جاتی تھی۔

اس وقت امتحان کے نتیجے قصبے کے ڈاک خانوں میں آیا کرتے تھے، اس دن لڑکے اور والدین ڈاک خانے پر جمع ہوجایا کرتے تھے۔ اسکول کے ماسٹر نتیجہ پڑھ کر سناتے جنہیں لڑکے بہت دھیان سے سنتے۔

ساستری بھی نتیجہ سننے کے لئے ڈاک خانے پہنچ گئے۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے اور اس گھبراہٹ میں وہ اپنا نتیجہ نہیں سن سکے۔ بعد میں ان کے استاد ایم۔ آر۔ سوامی نے انہیں بتایا کہ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہوئے اور تیرہویں پوزیشن حاصل کی ہے، ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہ اپنے ماں باپ کو یہ خوشخبری سنانے دوڑ پڑے۔

گھر آکر دیکھا کہ ان کے باپ کچھ لوگوں کے سامنے رامائن کا پاٹھ کر رہے ہیں۔ وہ پاٹھ ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ ان کے دل میں نتیجہ سنانے کی کھلبلی مچی ہوئی تھی، مگر وہ اطمینان اور سکون سے بیٹھے رہے۔ اطمینان اور سکون کی یہ کیفیت ان کی آئندہ کی عوامی زندگی میں بہت کام آئی۔ موقع ملتے ہی انہوں نے گھر والوں کو اچھے نمبروں سے پاس ہونے کی خبر سنا دی۔ گھر کے لوگوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ اس رات کوئی نہیں سو سکا اور سب آئندہ کے منصوبوں پر بات چیت کرتے رہے۔

کمبا کونم کے سرکاری کالج میں دو سال پڑھنے کے بعد پھر وہی مسئلہ سامنے تھا کہ

وہ آگے کی تعلیم جاری رکھ سکیں گے یا نہیں ؟

مگر اچھے دن جیسے ان کے انتظار میں تھے ۔ انٹرمیڈیٹ (ایف اے) کے امتحان میں شاستری نے مدراس پریسیڈینسی میں اول پوزیشن حاصل کی ۔ اس بار بھی ان کے ایک استاد ایم۔ آر۔ سوامی ناتھن نے انہیں یہ خوشخبری سنائی۔ ان کے استاد نے یہ بات انہیں اس وقت بتائی جب ساستری اپنے کچھ ساتھیوں سے بات چیت کرنے میں مصروف تھے۔ اس خبر سے ان کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ مگر اطمینان اور سکون کی ان کی کیفیت میں فرق نہیں آیا اور دوستوں کے ساتھ پہلے کی طرح ہی بات چیت میں مصروف رہے۔ بعد میں وہ گھر گئے اور اپنے والدین کو یہ خوشخبری سنائی ۔

اسی کالج میں انہوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ 1888 میں بی اے کے امتحان میں ان کی مدراس پریسیڈینسی میں دوسری پوزیشن آئی ۔ انگریزی میں ان کی پہلی پوزیشن تھی اور سنسکرت میں انہیں سونے کا تمغہ ملا ۔ ان کے استادوں نے ان کی قابلیت کی خوب داد دی اور اپنی طرف سے تعریفی سندیں بھی دیں ۔

اگلے سال ساستری کو مایا ورم کے میونسپل اسکول میں ملازمت مل گئی۔ ان کی تنخواہ پچاس روپے ماہانہ مقرر ہوئی (جبکہ عام طور سے تنخواہ 40 روپے ہوتی تھی۔ انہیں تنخواہ میں خاص اضافہ دیا گیا تھا ۔)

ساستری میں پڑھانے کا بہت حوصلہ تھا اور وہ اچھے استاد ثابت ہوئے۔ کلاس میں وہ سخت نظم و پابندی رکھتے۔ مگر کلاس کے باہر لڑکوں سے بے تکلفی سے ملتے ۔ وہ ان کے ساتھ کھیلتے اور سیر و تفریح میں بھی ان کے ساتھ جاتے ۔ وہ ان کے ساتھ کھیلتے اور ندی میں تیرتے اور خوش خوش سب کا ساتھ دیتے ۔ ان کے شاگردوں میں ٹی۔ آر۔ وینکٹ رام شاستری بھی تھے جو بعد میں مدراس کے ممتاز قانون دانوں میں شمار ہوئے۔

تین سال کی معلمی کے بعد ساستری نے مدراس کے ٹیچرس ٹریننگ کالج میں داخلہ

لے لیا۔ انہیں تعلیمی کام، خاص طور پر پڑھانے سے بہت دلچسپی تھی اور اس کالج میں انہیں اس کی تربیت مل سکتی تھی، اس کالج میں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا، جس پر انہیں پورا عبور حاصل تھا۔ وہ اپنے استاد پروفیسر اے۔ اے۔ ہال تک کو غلطی پر ٹوک دیتے تھے، وہاں کافی آزادانہ ماحول تھا۔ استاد کی غلطی کو درست کرنے کا برا نہیں مانا جاتا تھا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ وہاں اس مقولے پر عمل ہوتا تھا کہ دانشگاہ میں کوئی دانشور کسی سے بڑا یا چھوٹا نہیں ہوتا۔

ساستری 26 سال کی عمر میں سالیم کے میونسپل کالج میں وائس پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہاں انہوں نے دو سال تک انگریزی پڑھائی۔ ان کے والدین کی خواہش تھی کہ وہ گھر اور خاندان کے لوگوں کے قریب رہیں چاہے انہیں کم تنخواہ ہی کیوں نہ ملے۔

سالیم میں اپنے قیام کے دوران وہ عوامی معاملات میں پڑنے لگے تھے ۔ اس وقت سی۔ وجے راگھو آچاریہ کا نام جنوبی ہندوستان کی سیاست میں کافی نمایاں ہو چکا تھا۔ وہ جنوب میں آزادی کی لڑائی کا بگل بجانے والے پہلے لوگوں میں تھے، انہوں نے سالیم میں ڈپٹی کلکٹر کی تقرری کے معاملے میں سرکاری فیصلے کے خلاف آواز اٹھائی۔ ساسترى اور ان کے کالج کے ساتھی شیش ایئر نے ملازمت سے نکالے جانے کی پرواہ کئے بنا راگھو آچاریہ کی آواز میں آواز ملائی ۔

1895 میں ساستری مدراس آگئے اور انہوں نے پچائی اپا کالج ہائی اسکول میں ملازمت کرلی۔ یہاں انہوں نے استادوں کی ایک انجمن "ٹیچرس گلڈ" قائم کی، جو آج تک سرگرم ہے۔

ساستری کو ہر طرح کی ناموری ملی۔ مگر وہ اپنے خاندان اور ماں باپ سے کبھی غافل نہیں رہے۔ انہیں احساس تھا کہ ان کے والدین کو ان کی بہت ضرورت ہے۔ پہلا موقع ملتے ہی انہوں نے کمباکونم ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری کے لئے درخواست دے دی مگر وہاں ان کا تقرر نہیں ہو سکا۔

گوکھلے کے اثرات

1905 کے وسط میں ساستری کو اپنے ایک دوست جی۔ اے۔ نٹیسن کا ایک خفیہ مراسلہ ملا۔ اس میں سرکردہ قومی رہنما گوپال کرشن گوکھلے کی قائم کی ہوئی "سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی" کا منشور دیا ہوا تھا۔ یہ سوسائٹی نوجوان گریجویٹ لڑکوں کو سوشل ورک کی ٹریننگ دینے کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔ ساستری اس سوسائٹی کے اغراض و مقاصد سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ اپنی تصنیف "اسٹوری آف مائی ایڈمیشن" میں لکھتے ہیں کہ "اس طرح کا سوال بار بار میرے دل میں اٹھتا رہا ہے، میں اکثر ایسی کسی تنظیم کے بارے میں سوچتا رہا ہوں، مگر عملی طور پر اس کا موقع نہیں ملا تھا۔"

اس کے بعد ساستری نے گوکھلے کی شان میں ایک مضمون لکھا، جو "انڈین ریویو" میں چھپا۔ 27 دسمبر 1905 کو انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس بنارس میں ہوا۔ گوکھلے اس کے صدر تھے۔ ساستری نے اس اجلاس میں شرکت کے دوران گوکھلے کو ایک خط لکھ کر "سرونٹس اف انڈیا سوسائٹی" کا ممبر بننے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے لکھا کہ "میں ایک اسکول ماسٹر ہوں۔ سترہ سال پڑھانے کا تجربہ ہے۔ بی اے پاس ہوں اور اب 37 سال کا ہوں۔۔۔ میں سوسائٹی کا ممبر بننے کا خواہش مند ہوں اور امید کرتا ہوں کہ میری اس درخواست کو منظور کیا جائے گا۔ میں یہ خط کسی فوری جوش میں آکر نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ بہت دن سوچ بچار کرکے اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔"

اپنے اس منصوبے پر عمل کرتے ہوئے وہ فروری 1906 میں پونہ گئے اور گوکھلے سے ملاقات کی۔ اپنی کتاب "مائی ماسٹر گوکھلے" میں وہ اس ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں "ان کے آدرش اور خیالات جلدی ہی سب پر حاوی ہوجاتے ہیں، ان کی گرم جوشی آپ کو پگھلا دیتی ہے، ان کی شخصیت کی ہمہ گیری اور منکسر مزاجی نے مجھ پر جادو کا سا اثر کیا۔ میرے دل میں یہ بات جم گئی کہ بے لوث خدمت کے لئے اس دنیا میں کوئی جگہ ہے تو

وہ یہی پونہ ہے اور یہی ایک ایسے رہنما ہیں جو ہندوستان کے نوجوانوں میں بہتر زندگی کا خواب جگا سکتے ہیں۔ میں محسوس کرنے لگا کہ مجھے اپنے سارے سوالوں کا جواب مل گیا ہے۔۔ مگر میں اپنے بے جان چہرے کا کیا کرتا، منہ سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا، میری زبان جیسے اچانک فالج گرنے سے گنگ ہوگئی ہو۔ میں نے دل میں سوچا کہ وہ مجھے کیا سمجھتے ہوں گے۔ میں تو جیسے مٹی کا مادھو تھا، ایسے وقت میں جب مجھے بولنے کی سب سے زیادہ ضرورت تھی میری زبان سے الفاظ گویا کوسوں دور ہوگئے تھے۔"

گوکھلے کی ساحرانہ شخصیت کا اثر جلدی ہی دوسروں نے بھی قبول کیا۔ گاندھی جی نے انہیں اپنا "سیاسی گرو" تسلیم کرلیا۔ دراصل گوکھلے نے ہی گاندھی جی کو ہندوستانی سیاست میں اتارا تھا۔ گاندھی جی نے جب "سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی" کا ممبر بننے کی گوکھلے سے خواہش ظاہر کی تو اس پر گوکھلے نے کہا تھا کہ وہ پہلے ایک سال تک ہندوستان میں گھوم پھر کر ملک کے موجودہ حالات کو سمجھیں۔ اس کے بعد اگر محسوس کریں تو "سوسائٹی" میں شامل ہوکر اس کے صدر بن سکتے ہیں۔ مگر گاندھی جی کو یہ ایک سال پورا کرنے کا موقع ہی نہیں ملا اور گوکھلے کا 1915 میں انتقال ہوگیا۔ بعد میں گاندھی جی نے سوسائٹی کا ایک رکن بننے کی درخواست دی مگر خیالات میں اختلافات پیدا ہونے سے انہوں نے اپنی درخواست واپس لے لی۔ اس طرح انہوں نے سوسائٹی کو درخواست نامنظور کرنے کی پریشانیوں سے بچا لیا۔

گاندھی جی نے اس واقعے کے بارے میں جو لکھا ہے، وہ بہت دلچسپ ہے۔ انہوں نے لکھا کہ "میں گوکھلے کو اپنا سیاسی گرو مانتا ہوں" اس حیثیت سے ساستری میرا "گرو بھائی" ہوا۔ مگر وہ چیلا بھی گرو نکلا۔ وہ بہت پیارا لٹیرا ہے۔ مجھے گوکھلے کا جانشین بننے کا اعزاز حاصل ہونے والا تھا، مگر میں نے دیکھا کہ ساستری اس کے زیادہ شایان شان ہوگا۔ میں بہت خوشی اور ذہنی سکون کے ساتھ اس کے حق میں دستبردار ہوگیا۔" یہاں یہ

حقیقت بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ساستری اور گاندھی جی بالکل ہم عصر تھے ساستری بس ان سے دس دن بڑے تھے۔ گوکھلے کا انتقال ہونے پر ساستری کو " سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی " کا صدر بنایا گیا۔ انہوں نے اپنے کو پوری طرح سیاسی زندگی کی نذر کر دیا اور جلدی ہی اپنی ایک الگ پہچان بنا لی۔ ساستری ایک معلم سے اب ایک سیاست داں بن گئے۔

ساستری کے بارے میں ایک دلچسپ کہانی کہی جاتی ہے جو گوکھلے کے ساتھ ان کے تعلقات کے بارے میں ہے۔ گوکھلے بہت " تنک مزاج " تھے، ذرا ذرا سی بات پر غصہ ہوجاتے تھے، مگر ساستری پر انہوں نے کبھی غصہ نہیں دکھایا۔ ساستری نے سوچا کہ گوکھلے شاید انہیں زیادہ عزیز نہیں رکھتے ہیں اسی لئے انہوں نے کبھی ان پر غصہ نہیں اتارا۔ اور ایک دن وہ خود یہ بات گوکھلے سے پوچھ بیٹھے، گوکھلے کا جواب تھا " جب تک تم کوئی غلطی نہیں کروگے تو میں تم پر غصہ بھی نہیں کروں گا۔"

خاندان

سری نواس ساستری کی شادی 14 سال کی کم عمر میں ہوگئی تھی۔ جب وہ اسکول میں پڑھتے تھے۔ ان کی بیوی پاروتی ان سے بہت چھوٹی تھیں۔ دونوں کو ملے جلے خاندان کا تحفظ ملا ہوا تھا۔ مگر تیرہ سال بعد 1896 میں پاروتی کا انتقال ہوگیا اور وہ اپنے پیچھے ڈیڑھ سال کا ایک بچہ چھوڑ گئیں۔

اگلے سال ساستری کی دوسری شادی ہوگئی۔ ان کی دوسری بیوی لکشمی ساری زندگی ان کی اخلاقی مددگار بنی رہیں۔ ساستری اپنی دوسری بیوی کی دلکشی، خوش مزاجی اور سوجھ بوجھ پر فریفتہ تھے۔ 1927 میں جب وہ حکومت کے ایجنٹ کی حیثیت سے جنوبی افریقہ جانے لگے تو بیوی کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے، مگر پھر انہوں نے سوچا کہ جنوبی

افریقہ میں انہیں اپنے کام میں پوری توجہ اور پورا وقت دینے کی ضرورت ہوگی۔ لکشمی اس نزاکت کو سمجھ گئیں اور ان کے ساتھ نہیں گئیں ۔ جس کا مطلب لمبی جدائی تھا۔ 1928 میں جنوبی افریقہ سے لوٹنے پر برطانوی حکومت نے انہیں نائٹ کے خطاب سے نوازنا چاہا مگر ساسری نے اس سے انکار کر دیا۔ انہیں یاد آیا کہ ان کے گرو گوکھلے نے بھی اسی طرح کی پیشکش ٹھکرا دی تھی۔ لکشمی کو اس سے کچھ افسوس بھی ہوا مگر انہوں نے اپنے شوہر کے جذبات کا پاس رکھا اور ہر طرح ان کا ساتھ دیا۔

ساستری اپنی خاندانی زندگی سے مطمئن تھے۔ وہ ایک خوش نصیب شوہر تھے اور اپنے بچوں پر ناز کرتے تھے۔ قومی کاموں میں الجھے رہنے پر بھی وہ خاندان سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ انہیں اپنے خاندان سے گہرا لگاؤ تھا۔ اکثر وہ اپنی بیٹی رکمنی کو خط لکھ کر اپنے خیالات اور تجربات سے آگاہ رکھتے تھے ۔

ایک بار "قیصر ہند" جہاز پر انگلینڈ کے سفر کے دوران ایک ساتھی مسافر راس السٹران سے کہہ بیٹھا کہ "آپ گوشت نہیں کھاتے، شراب نوشی نہیں کرتے، سگار سگریٹ نہیں پیتے، تاش سے دل نہیں بہلاتے، ناچتے نہیں، خوبصورت عورتوں سے ہنسی ٹھٹول نہیں کرتے، تو پھر آپ جہاز سے سمندر میں چھلانگ کیوں نہیں لگا دیتے ۔"

اس مسخرے کی بات کو یاد کرتے ہوئے ساستری نے لکھا کہ "اگر میں جوان ہوتا تو اس سیدھے سادے فلسفے سے ضرور لطف اندوز ہوتا۔"

ساستری پوری طرح سبزی خور تھے ۔ مگر ایک بار فرانس میں انہیں اسے ترک کرنا پڑا۔ 1931 میں فرانس کے سفر کے دوران وہ بیمار پڑ گئے۔ دل کی تکلیف کا اندیشہ تھا۔ ڈاکٹروں نے انہیں غذا میں مچھلی کھانے کا مشورہ دیا۔ خوش ذائقہ انداز میں پیش کی گئی مچھلی انہوں نے کھائی اور کچھ دن برابر وہ اس کا استعمال کرتے رہے ۔ مگر شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ سگریٹ وغیرہ سے ہمیشہ پرہیز رکھا ۔ تاش کھیلنے کو وہ برا سمجھتے تھے، حالانکہ

زندگی میں دو ایک بار اس سے دل ضرور بہلایا تھا۔

ساستری عموماً جنوبی ہندوستان میں رائج لباس ـــ دھوتی، بند گلے کا کوٹ، صافہ اور چپل ـــ پہنتے تھے۔ مغربی ملکوں کے سفر کے دوران سوٹ بوٹ بھی پہن لیتے تھے، مگر انہیں زیادہ آرام دیسی لباس میں ہی ملتا تھا۔

جادو بیاں مقرر

ساستری کو اکثر و بیشتر تقریر کرنی پڑتی تھی، ان کی تقریروں میں خیالات کی وضاحت، طرز ادا کی شان اور زبان کی چاشنی ہوتی تھی۔ وہ جہاں بھی بولتے لوگ پوری توجہ سے انہیں سنتے۔ انگریزی پر انہیں پورا عبور حاصل تھا۔ لوگ انہیں "رسیلی زبان کا شری نواس ساستری" کہا کرتے تھے۔

جنیوا میں "لیگ آف نیشنس" کے اجلاس میں انہوں نے 1921 میں تقریر کی تھی۔ لیگ کے نمائندوں نے خیالات کی بلندی اور ادائیگی کی شیرینی کے لئے اس تقریر کی خوب داد دی۔ ساستری نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ "یہاں جو نظارہ دیکھنے کو مل رہا ہے، وہ ہر دل کو تڑپا دے گا، دنیا کے کونے کونے سے مختلف بر اعظموں اور ملکوں کی نمائندگی کرنے والے یہاں جمع ہیں، ان میں سے کچھ بہت ترقی یافتہ ہیں، کچھ کافی پچھڑے ہوئے اور کمزور ہیں مگر سبھی کے دلوں میں ماضی کی تلخیوں کی یاد تازہ ہے اور سبھی انسانیت کی بہتری کے لئے بیتاب ہیں۔"

ساستری جہاں بھی تقریر کرتے، چاہے وہ ادبی محفل ہو یا سیاسی مجمع، ہر جگہ ان کی دھاک بیٹھ جاتی تھی۔ جنوبی افریقہ میں جہاں حکومت کا رویہ ان کے موافق نہیں تھا اور انہیں اپنی بات کہنے میں طرح طرح کی دقتوں کا سامنا تھا، وہاں بھی جلدی ہی انہوں نے اپنی دھاک بٹھا لی۔ وہاں کے اخباروں نے ان کے بارے میں بہت اچھی

رائے دی۔ اخباروں نے انہیں دنیا کے چنے ہوئے سیاست دانوں میں سے ایک بتایا۔ ان کی پروقار شخصیت کی تعریف کی۔ جنوبی افریقہ کے ایک اخبار " انڈین اوپینین " نے لکھا کہ جنوبی افریقہ کا حکمراں طبقہ ساستری کو اعتبار کے لائق سمجھنے لگا ہے۔ وہ لوگ ان کی دانشمندانہ سوجھ بوجھ کے قائل ہوتے جارہے ہیں، ان میں جو سادگی اور کشش ہے اس کا جادوئی اثر ہونے لگا ہے۔ یہ اخبار مہاتما گاندھی کے بیٹے منی لال نکالتے تھے۔

1934 میں پونہ کے فرگوسن کالج کی انگریزی ادبی انجمن کی سالگرہ کے موقع پر " تقریر کے فن " پر انہوں نے خطاب کیا۔ اس میں انہوں نے صلاح دی کہ "دماغ کو ہمیشہ کھلا رکھئے اور زندگی کے ہر موڑ پر نئی نئی باتیں سیکھنے کا شوق بنائے رکھئے۔"

ایسا نہیں ہے کہ ساستری تقریر کرتے وقت گھبراتے نہیں تھے، مگر ان کی گھبراہٹ بس لمحے بھر کی ہوتی اور بولنا شروع کرتے تو ان کی گھبراہٹ جلدی ہی ختم ہوجاتی۔ وہ تقریر کرنے سے پہلے ہمیشہ تیار ہوکر جاتے تاکہ ہر لفظ اپنی جگہ بہت نپا تلا دکھائی دے۔

اپنی سوانح میں ساستری لکھتے ہیں کہ "جب بھی انہیں لوگوں کے سامنے بولنے کے لئے مدعو کیا جاتا وہ یہی دعا مانگتے کہ وہ بیمار پڑ جائیں یا اور کچھ ایسا ہوجائے کہ یہ پروگرام ٹل جائے۔ لوگوں کے سامنے تقریر کرنے پر ساستری کو نئے نئے اور عجیب طرح کے تجربے بھی ہوئے۔ سیاسی موضوع پر بولنے میں اکثر انہیں قباحت کا سامنا کرنا پڑا۔ خاص طور سے ایسے موقعوں پر جب گاندھی جی کی عدم تعاون یا نان کوآپریشن کی تحریک کے خلاف وہ زبان کھولتے، لوگ بیچ میں ٹوکا ٹاکی کرکے انہیں تقریر کرنے سے روک دیتے۔ اس طرح کا تجربہ انہیں لندن، بمبئی اور پونہ میں ہوا ہی تھا۔ خود اپنے شہر کمباکونم میں بھی ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

ساستری کو 1922 میں ایک عجیب و غریب تجربہ ہوا، امریکہ کے بالٹی مور میں انگریزی کی ایک ایسوسی ایشن کی سالانہ تقریب میں وہ بولنے گئے تھے۔ ساستری نے بہت

محنت سے اس موقع کے لئے اپنی تقریر تیار کی تھی۔ مگر بڑے مجمع کو دیکھ کر جیسے وہ گھبرا گئے۔ انہیں اپنی تقریر کا کوئی نکتہ بھی یاد نہیں آیا۔ مگر خوش قسمتی سے ان کے ذہن میں بالکل ایک نئی بات آگئی، اس پر انہوں نے بہت تفصیل سے تقریر کی۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ تقریر ختم ہونے پر لوگ اس کی داد دیتے نہیں تھک رہے تھے۔

تخیل پرست

پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح ساستری بھی تخیل پرست تھے۔ 1921 میں انہیں شہریوں کی طرف سے لندن شہر کی کنجی دی گئی۔ یعنی انہیں "فری ڈم آف دی سٹی" کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اس موقع پر اپنی تقریر میں انہوں نے کہا کہ اس اعزاز کو وہ برطانیہ کے ذریعہ ہندوستان کو "فری ڈم" (آزادی) دینے کا پیش خیمہ تصور کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ برطانیہ کو اپنے سوچنے کے انداز میں تبدیلی لانی چاہئے۔ اسے ایسا "کنجوس نہیں بنے رہنا چاہئے جو ہر چیز کو سینت کر اپنے پاس رکھتا ہے، چاہے وہ اس کے کام کی ہو یا نہ ہو۔ آزادی کو کسی خاص علاقے اور کچھ خاص لوگوں تک محدود نہیں رکھا جاسکتا۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ آخر وہ کیا کرنا چاہتے ہیں"

پنڈت نہرو کے آنے والے شاندار زمانے کا تصور کرتے ہوئے 1942 میں اپنے ایک نشریے میں وہ کہتے ہیں۔۔

"ہمارے عزیز دوست! اب اپنی تصور کی آنکھ کھولیں اور دیکھیں کہ ہندوستان کا وزیراعظم برطانوی کامن ویلتھ کی بیٹھک میں اپنا سر بلند کئے ہوئے ہے۔ یا مستقبل کی عالمگیر انجمن میں ہندوستان کے 39 کروڑ لوگوں کی طرف سے پورے وثوق سے بول رہا ہے۔ اور چرچل اور فیلڈ مارشل اسمٹس کی ہمسری کر رہا ہے۔ یہ تصور آپ کو فخر کے احساس سے لبریز کر دے گا۔"

عوامی زندگی میں ساستری کی شرکت 1913 میں شروع ہوئی۔ جب وہ مدراس قانون ساز اسمبلی کے رکن نامزد کیے گئے تھے۔ لارڈ پینٹ لینڈ 1913 میں مدراس کے گورنر بنا کر بھیجے گئے تھے۔ ہندوستان پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے سری نواسا ساستری کا نام سن رکھا تھا۔ مدراس میں اپنا عہدہ سنبھالتے ہی انہوں نے شاستری کو قانون ساز مجلس کا رکن نامزد کر دیا۔ سرکار کی طرف سے نامزد ممبر ہونے کے باوجود وہ ہر معاملے میں حکومت کی حمایت نہیں کرتے تھے۔ ہر معاملے کو وہ اس کی اچھائی برائی کی بنیاد پر پرکھتے، اور اپنی رائے قائم کرتے اور اس پر ڈٹے رہتے۔ انہوں نے قانون ساز مجلس میں کئی تجویزیں پیش کیں۔ تعلیم میں ان کی خاص دلچسپی تھی۔ تعلیم کے معاملے میں بھی انہوں نے کئی تجویزیں پیش کیں۔ ان کی یہ دلیل تھی کہ جن لوگوں کو کچھ تعلیم مل چکی ہے ان کو اور بہتر تعلیم کے مواقع فراہم کرنے سے زیادہ اچھا ہوگا کہ پہلے ان لوگوں کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے جو ابھی تک تعلیم سے محروم رہے ہیں۔

مدراس کونسل میں ساستری کے کام کاج کے بارے میں مدراس کے ایڈوکیٹ جنرل ایف۔ ایچ۔ ایم۔ کاربل نے لکھا ہے کہ "ساستری کی شخصیت میں ہمیں ایک ایسا قانون ساز ملا ہے جس پر ہر شخص ناز کر سکتا ہے۔ کونسل میں ان کی دلیلوں کو سن کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ اپنے پسندیدہ موضوع پر جب وہ زبان کھولتے ہیں تو بہت خوش اسلوبی سے دلیلوں کا انبار لگا دیتے ہیں۔ وہ بہت ہمت اور ثابت قدمی سے اپنی بات کہتے ہیں۔ تجویز کے گر جانے پر بھی ان کے چہرے کی بشاشت کم نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک پیدائشی قانون ساز ہیں۔" 1916 میں مدراس قانون ساز کے ممبروں نے انہیں دہلی کی قانون ساز اسمبلی کے لئے منتخب کر لیا۔

17 فروری 1918 کو انہوں نے اسمبلی میں یہ تجویز پیش کی کہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی۔ اور ریلوے میں انجینئروں کی بھرتی پوری طرح ہندوستان میں کی جانی چاہئے، البتہ کچھ عہدے

"رائل سروسز" کے لئے محفوظ کئے جاسکتے ہیں۔ ان کی یہ تجویز پاس نہیں ہوئی۔ ریلوے اور ڈاک تار محکمے میں ہندوستانیوں کے مقابلے میں اینگلو انڈین لوگوں کو ترجیح دینے پر انہیں سخت اعتراض تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس میں نسلی امتیاز نہیں برتا جانا چاہئے اور سبھی کے لئے ایک جیسی اعلیٰ تعلیم کی شرط رکھی جانی چاہیئے۔ اپنے مخصوص انداز میں انہوں نے کہا کہ " ناانصافی کو انصاف اور ناجائز کو جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ بے جا پاسداری کو صرف اس لئے روا نہیں رکھا جانا چاہئے کہ یہ پہلے سے چلی آرہی ہے۔ اگر برطانوی انتظامی امور کے بارے میں میری معلومات صحیح ہے تو اس میں اتنا دم ہے کہ وہ عرصے سے چلی آرہی ان برائیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر سکتی ہے۔" انہوں نے حکومت ہند سے بار بار اپیل کی کہ وہ ہندوستان میں سبھی کے لئے مفت اور لازمی تعلیم کی ذمہ دار اٹھائے۔

راؤلٹ ایکٹ

ہندوستان کے لوگوں میں اس وقت غم و غصہ کافی بڑھا ہوا تھا۔ 1918 کے راؤلٹ ایکٹ کو لے کر لوگ کافی برہم تھے۔ اس قانون کے تحت کسی مقدمے اور عدالتی کارروائی کے بغیر کسی بھی شخص کو گرفتار کرکے جیل میں ڈالنے کا اختیار حکومت نے حاصل کرلیا تھا۔ اس سے کسی بھی آدمی کو عدالت میں حاضر ہوکر دفاع کرنے کے اختیار سے محروم کر دیا گیا تھا۔ جبکہ یہ حق برطانیہ میں افراد کی آزادی کی بنیاد مانا جاتا رہا ہے۔

حکومت کے رویئے میں یہ منفی تبدیلی تھی۔ ساستری نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور کونسل میں اس قانون کو پاس کرنے کی بار بار مخالفت کی۔ بل پر بحث کے دوران انہوں نے صاف صاف جتا دیا کہ " ہم میں سے کسی کو بھی یہ اختیار نہیں پہنچتا کہ وہ ملک میں پرتشدد حالات کو بڑھاوا دے۔ میں تو یہاں تک کہنے کی جسارت کروں گا کہ

اپنے آپ کو نرم رویئے کا حامل کہنے والوں کو تو اس کا بالکل اختیار نہیں پہنچتا۔ تشدد آمیز حالات پہلے سے بنے ہوئے ہیں۔ لوگوں کے جذبات برانگیختہ ہیں۔ ہم یہاں جو بھی بات کہیں اس کا عام سیاسی زندگی پر اچھا اثر پڑنا چاہیے۔ بل کی مخالفت میں تحریک تو پہلے سے ہی چل رہی ہے۔ میں حکومت میں شامل اپنے دوستوں کو آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر میری اپیل رد کر دی گئی اور یہ بل پاس کر دیا گیا تو یہ ہمارے فرائض میں کوتاہی ہوگی۔ ایسی حالت میں میرا یہ فرض بنتا ہے کہ میں بھی اس تحریک میں کود پڑوں۔ یہ کوئی دھمکی نہیں ہے، بہرحال میں اپنے معاملات کا خود فیصلہ کرنے والا ہوں۔ میں کوئی دھمکی آمیز کارروائی بھی نہیں کرنا چاہتا، ابھی تک میں اس تحریک سے دور رہا ہوں۔ اگر سب تدبیریں الٹی پڑ گئیں اور ہمیں اس قانون کا سامنا کرنا ہی پڑا تو اپنے خیالات کے مدنظر میں شاید خود کو اس تحریک سے الگ نہیں رکھ سکوں گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آخرکار اس کا کیا انجام ہوگا۔"

جلیاں والا باغ

اور انجام واقعی برا نکلا۔ ملک میں تشدد کے حالات میں تیزی آتی گئی۔ جس کی انتہا جلیاں والا باغ کے سانحے پر ہوئی۔ 13 اپریل 1919 کو جنرل ڈائر کی سفاکانہ کارروائی سے جلیاں والا باغ میں قتل عام ہوا۔ اگلے کچھ ہفتوں میں پنجاب میں سر مائیکل اوڈائر کی حکومت کی دہشت انگیزی اپنے عروج پر تھی۔

1920 میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں انڈین نیشنل کانگریس نے "مونٹ فورڈ" اصلاحات کے خلاف عدم تعاون کی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ سری نواسا ساستری اس کے حق میں نہیں تھے، ان کا ماننا تھا کہ قوم پرستوں کو حکومت میں شامل ہوکر ملکی انتظام چلانے میں حصہ دار بننا چاہیے۔ اس سال وہ کونسل آف اسٹیٹس یعنی ایوان بالا کے

لئے منتخب ہو گئے۔ اگلے سال 1921 میں انہیں پریوی کونسل کا ممبر بنایا گیا۔

بیرونی ملکوں میں

1921 سے 1932 کے درمیان سری نواسا ساستری کو کئی بار بیرونی ملکوں میں سرکاری اور غیر سرکاری مشن پر بھیجا گیا۔ ان کا تعلق زیادہ تر غیر ملکوں میں رہنے والے ہندوستانیوں کے مسائل سے تھا۔ 1919 میں انہوں نے لندن کا پہلا سفر "مونٹ۔ فورڈ" اصلاحات کے سلسلے میں کیا۔ 1921 میں وائسرائے نے انہیں امپیریل کانفرنس کا نمائندہ نامزد کیا۔ اس کانفرنس میں انہوں نے باہری ملکوں میں آباد ہندوستانیوں کے مسائل پر تقریر کی۔ یہ تقریر بہت پسند کی گئی۔ کناڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے وزیر اعظموں نے انہیں اپنے ملکوں میں تبادلۂ خیال کے لئے مدعو کیا۔

واشنگٹن میں انہوں نے امریکی کانگریس کو خطاب کیا۔ اس وقت "نیویارک ٹائمز" نے تبصرہ کیا کہ "اس کانفرنس میں برطانیہ کا ایک ایسا نمائندہ آیا ہے جو بہت کم وقت کے لئے پبلک کے سامنے آیا مگر اپنا پرزور تاثر چھوڑ گیا۔ یہ شخص کانفرنس میں امریکہ کے لئے بالکل انجان ہے مگر ہندوستان سے آئے اس سری ساستری نواسا کو آئندہ سننے کا ضرور موقع ملے گا۔ ہندوستان کے بارے میں اس نے صرف دو بار تقریر کی۔ لوگوں کو گمان تھا کہ وہ ہندوستان کے بارے میں برطانوی حکومت کے خیالات کی ترجمانی کرے گا مگر یہ بات غلط ثابت ہوئی۔ اس نے یہ بات نہیں چھپائی کہ ہندوستان کے لوگ سیلف گورمنٹ چاہتے ہیں۔ اس نے یہ بات بھی نہیں چھپائی کہ وہ ہندوستانی تہذیب پر نازاں ہے۔ اور ہندو تہذیب سے گہری عقیدت رکھتا ہے۔ وہ جب ہندوستانیوں کی امنگوں اور حوصلوں کی بات کرتا ہے تو اس میں بہت دانشمندی ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سب کچھ ایک دن میں نہیں کیا جاسکتا اور یہ کہ کسی بنی بنائی اچھی چیز کو ڈھا دینا آسان ہوتا ہے

جبکہ اس سے بہتر کوئی چیز بنا پانا آسان نہیں ہوتا۔ جن لوگوں نے اس کی تقریر سنی ہے ان کا ماننا ہے کہ شاستری بہت عمدہ اور کھرا آدمی ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ وہ برطانوی اور امریکی نمائندوں سے بہتر انگریزی بولتا ہے۔"

ستمبر 1921 میں ساستری نے جینیوا میں لیگ آف نیشنس کے اجلاس میں دنیا بھر کے سیاست دانوں کے اجتماع کو خطاب کیا۔ اس وقت انہیں کافی داد ملی۔ پرسکون چہرے مہرے والے سفید صافہ باندھے اس شخص نے نمائندوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ انہوں نے زبان کی چاشنی میں ڈوبے اس کے اعلیٰ خیالات سنے۔ ساستری نے لیگ کے کام کاج کو وسیع تناظر میں پیش کیا تھا۔

جنوبی افریقہ میں

خوش بیانی کے اپنے جادو کے باوجود ساستری اگر کہیں اپنا فوری تاثر نہیں چھوڑ سکے تو وہ جگہ جنوبی افریقہ تھی۔ وہاں کی حکومت نسلی امتیاز برتتی تھی۔ ساستری وہاں برطانوی حکومت کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ وہ وہاں حکومت ہند کے ایجنٹ جنرل مقرر ہوئے تھے۔ 1927 میں پہلی بار اس طرح کی تقرری عمل میں آئی تھی۔ جنوبی افریقہ کی حکومت نے ان سے سرد مہری برتی۔ مگر اپنے ڈیڑھ سال کے قیام کے دوران انہوں نے وہاں رہنے والے ہندوستانیوں کی زندگی میں کچھ اصلاح ضرور لا دی۔ انہوں نے ناٹال میں ہندوستانیوں کے لئے ایک اسکول قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ یہ ان کا بڑا کارنامہ تھا۔ شاستری نے اپنی پرسکون شخصیت کا جادو جگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ جنوبی افریقہ کے ایک وزیراعظم جے۔ بی۔ ایچ۔ ہرٹزوگ کا کہنا تھا کہ "جنوبی افریقہ آ کر کسی نے ہمارے لوگوں کا دل جیتا ہے تو وہ صرف سری نواسا ساستری ہے۔"

لندن میں گول میز کانفرنس کے دوران بھی ان کی ایسی ہی حکمت عملی رہی جہاں کئی بار انہیں بلایا گیا تھا۔ اپنی خوش بیانی اور خیالات کی صفائی کے علاوہ ان میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ دوسرے کے نقطۂ نظر کو جلدی ہی اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔ انگریزوں کے ساتھ معاملات میں ان کی یہ صلاحیت بہت کام آئی۔ یہ ان کی ہی حکمت عملی کا نتیجہ تھا کہ 1931 میں گاندھی اروِن معاہدہ ہوسکا۔ گاندھی جی کے ساتھ بات چیت کے بعد وہ بار بار لارڈ اروِن کو سمجھانے جاتے۔ وائسرائے نے 4 مارچ کو ساستری کے اس کارنامے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے دستخط سے ایک خط لکھا۔ لارڈ اروِن نے لکھا کہ "آپ نے گاندھی جی کے ساتھ معاہدہ کرانے میں جو رول ادا کیا اس کے لیے میں آپ کا شکر گذار ہوں۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ نے کس طرح یہ کام انجام دیا اور یقین کیجئے میں اس کے لیے آپ کا احسان مند ہوں۔"

پیش گوئی

1943 میں جب گاندھی جی جیل میں تھے ساستری نے بہت مدبرانہ شان سے انگریزوں کو خط لکھے۔ ایل۔ ایس۔ ایمیری کو ایسے ہی ایک خط میں وہ لکھتے ہیں۔ "ہمارے قابل احترام رہنماؤں سے یہ امید کرنا فضول ہے کہ وہ وائسرائے کے محل کی چوکھٹ پر ناک رگڑیں گے اور آنسو بہاکر ندامت کا اظہار کریں گے۔ ایسے میں ایک اعلیٰ ظرف فاتح اور زخموں کو بھرنے والی مدبرانہ شان دکھانے کی ضرورت ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خدا کے واسطے اس قدیم اور متبرک ملک کی خاک پر زہریلے دانت مت گڑائے۔"

اسی ولولے اور شان کے ساتھ ساستری نے اپنے ہم وطنوں سے قومی اتحاد جیسے معاملوں پر کھل کر اظہار خیال کیا۔ انہوں نے بستر مرگ سے اپنا آخری خط جو لکھا وہ

گاندھی جی کے نام تھا۔ اس خط میں انہوں نے تاکید کی تھی کہ "انہیں کبھی بھی پاکستان کے خیال کی تائید نہیں کرنی چاہیے۔ اس تقسیم سے پنجاب اور بنگال برباد ہوجائیں گے۔ اگر کسی دباؤ میں آکر آپ اسے مان گئے تو یہی سمجھا جائے گا کہ آپ اپنا ہوش و حواس گنوا بیٹھے ہیں۔ ہندوستان کو اپنے کسی بھی حصے کو الگ کرکے آزاد نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے ہندوستان کو گہرا زخم لگے گا۔ اس سے ہمیشہ کے لئے ایک دشمن پیدا ہوجائے گا۔"

1946 کے شروع میں ساستری بیمار پڑے اور انہیں مدراس کے جنرل اسپتال میں داخل کیا گیا۔ گاندھی جی تین بار انہیں دیکھنے آئے۔ ساستری جذبات سے مغلوب ہوگئے اور گاندھی جی سے بات چیت میں ان کا موازنہ بھگوان رام سے کرگئے۔ گاندھی جی اس پر خفا ہوئے۔ اور کہا کہ "ساستری تم کیسی بے تکی بات کر رہے ہو۔"

اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ساستری نے بالمیکی رامائن پر انگریزی میں کئی لیکچر دیے۔ ان کے نزدیک رامائن دنیا کی بیش بہا تصنیف تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ دنیا کے ادب میں اس کے پائے کا کوئی اور شاہکار نہیں ہے۔ یہ شاعرانہ عظمت کا بیش بہا نمونہ ہے۔

سیاسی میدان سے اپنے کو عملی طور پر الگ کرنے کے بعد ساستری ایک بار پھر اپنے پسندیدہ تعلیم کے میدان میں لوٹ آئے۔ 1935 میں پہلی بار انہوں نے اناملائی یونیورسٹی کی وائس چانسلری قبول کی۔ وہ دوسری بار بھی اس عہدے پر منتخب ہوئے۔ اور مارچ 1940 میں اس عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ یونیورسٹی میں ان کا نام نہایت احترام سے لیا جاتا ہے۔ ان کی خطیبانہ شان کو یاد کیا جاتا ہے ان کے نام سے وہاں ایک بڑا کتب خانہ اور ایک آڈیٹوریم قائم ہے۔

سری نواسا ساستری ہندوستانی تہذیب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ ان میں

ہندوستان کی تہذیبی وراثت سے دنیا کو روشناس کرانے کی زبردست صلاحیت تھی۔ 17 اپریل 1946 کو ان کا انتقال ہوا۔ سروجنی نائیڈو نے اس وقت کہا تھا کہ ٹیگور کے بعد ساسری ہی کی ایک ایسی شخصیت تھی جس نے باہری دنیا کو ہندوستانی تہذیب و تمدن سے آشنا کرایا۔

"آزادی کے مسرتوں کو الفاظ میں بیان کرنا یقینا بہت مشکل ہے۔ ان کی حقیقی خوشی کو تو صرف وہی بدنصیب محسوس کرسکتے ہیں جو خود کبھی اس نعمت کو کھو چکے ہوں۔ کبھی کبھی میں محسوس کرتا ہوں اور اس سے مجھے دکھ ہوتا ہے، کہ کچھ لوگ آزادی کے بارے میں ایسے بات کرتے ہیں جیسے وہ کوئی نئی ایجاد ہو، یا کوئی عطائی قسم کا نسخہ ان کے ہاتھ لگ گیا ہو جسے انھوں نے اپنے نام پر پیٹنٹ (رجسٹر) کروالیا ہو۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے بزرگ آزادی کے لیے لڑے ہیں، انھوں نے قربانیاں دی ہیں اور تکلیفیں جھیلی ہیں۔" اس لیے یہ صرف ہمارا حق ہے۔ وہ لوگ اس میں ہمارے حصے دار نہیں ہوسکتے جنھوں نے ہمارے ساتھ صعوبتیں نہیں اٹھائیں، جنھوں نے اسے حاصل کرنے میں چنوتیاں اور بدنصیبیاں نہیں جھیلیں۔ وہ آئیں اور اگر ان میں ہمت ہو تو ہم سے لے لیں، مگر ہم خود تو انھیں اسے سونپنے والے نہیں ہیں۔ بہر طور، میں یہی سمجھتا ہوں کہ آزادی جیسی چیز کے لیے یہ کوئی قابلِ قدر انداز فکر نہیں ہے۔"

وی۔ ایس۔ سری نواسا ساستری

خان عبدالغفار خاں

شری نواس ایس۔سوہنی

"صداقت، محبت اور خدا اور انسانیت کی خدمت ہی میرا مذہب ہے۔ اس دنیا میں جتنے بھی مذہب ہیں، سب نے محبت اور بھائی چارے کا سبق دیا ہے۔ جو لوگ اپنے پڑوسیوں کی بھلائی سے غافل ہیں اور جن کے دل محبت سے عاری ہیں، وہ جانتے ہی نہیں کہ مذہب کیا ہے؟"

خان عبدالغفار خاں

خان عبدالغفار خاں

بادشاہ خاں کے نام سے مشہور خان عبدالغفار خاں کی شخصیت ہماری آزادی کی لڑائی کی تاریخ میں بہت روح پرور رہی ہے۔ ان کی ساری زندگی، صداقت، محبت، خدمت اور قربانی کی نغمہ سرائی اور عبادت کی طرح ہے۔

خان عبدالغفار خاں کا جنم 1890 میں ہوا۔ اپنی سوانح "مائی لائف اینڈ اسٹرگل" میں وہ لکھتے ہیں کہ میری تاریخ پیدائش کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ مگر ماں کہا کرتی تھیں کہ اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کی 1901 میں شادی کے وقت ہماری عمر گیارہ سال کی تھی۔

خاندان

برطانوی ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے کے ہست نگر میں عثمان زئی گاؤں کے ایک بڑے باعزت پٹھان سردار کے خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ ان کے والد خان بہرام خاں کی شرافت اور سخاوت کی شہرت تھی۔ لوگ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ بہت مذہبی آدمی تھے۔ غریبوں اور ستائے ہوئے لوگوں کے لئے ان کے دل میں بہت محبت تھی۔ بادشاہ خان کہا کرتے تھے کہ ان کے باپ اجنبیوں اور

مسافروں کی بہت خاطر مدارات کرتے تھے وہ ان لوگوں کو اپنے گھر بلاتے اور مہمانوں کی طرح ان کی عزت کرتے۔ خان بہرام خاں بالکل اتفاقیہ طور پر آجانے والے لوگوں کو خدا کا بھیجا ہوا مہمان سمجھتے تھے وہ خود ان کے لئے کھانا لاتے ۔ اپنی پیٹھ پر روٹی کی ٹوکری اور ہاتھ میں سالن کا برتن لے کر ہر ایک کے سامنے خود کھانا لگاتے ۔

خان بہرام خاں ایسے لوگوں کا بہت خیال رکھتے تھے جو دوسروں کے ستائے ہوئے تھے۔ ایسے لوگوں کو وہ ڈھونڈ نکالتے اور ان کی مدد کرتے۔ کھانے اور روپے پیسے کے علاوہ انہیں زمین تک دے دیتے۔ وہ اذیت دینے والوں کو بھی نہیں بخشتے تھے اور ستائے ہوئے لوگوں کی طرف سے ان سے پوچھ تاچھ کرتے تھے۔

بادشاہ خان کی ماں گاؤں کے سارے غریبوں کی ماں تھیں ۔ وہ اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتیں اور غریبوں میں تقسیم کرتیں۔ عثمان زئی ہی نہیں، آس پاس کے گاؤوں میں بھی اس خاندان کا بول بالا تھا۔ اس علاقے کے لوگ اس زمانے سے ہی ان کے خاندان کی عزت کرتے تھے، جب بادشاہ خاں کے پردادا خان عبیداللہ خاں نے اس علاقے کو درّانیوں کی حکمرانی میں جانے سے بچایا تھا۔ درّانی قبیلے کے روایتی حکمرانی چلی آرہی تھی۔ وہ پرانے طرز پر حکمرانی کرتے تھے۔ لوگوں کو سخت سزائیں اور اذیتیں دیتے تھے اور لوگوں کی سماجی معاشی زندگی کی طرف سے بالکل لاپرواہ تھے ۔

بادشاہ خاں کے دادا خان سیف اللہ خاں میں بھی خدمت اور ایثار کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ جب برطانیہ والوں نے لوگوں پر ظلم ڈھانا شروع کیا تو خان سیف اللہ نے آزادی کے سورماؤں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملاکر محب وطن پختونوں کا ساتھ دیا۔

غرض بادشاہ خاں نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جو خدمت کے جذبے سے سرشار تھا۔ بادشاہ خاں کو انسانوں سے محبت کرنے اور فرض شناسی اور ایثار کا جذبہ وراثت میں ملا تھا۔ ان کے خاندان کے لوگ ان نیک جذبات کی زندہ مثال تھے۔

پٹھانوں کا یہ علاقہ، یعنی شمال مغربی سرحدی صوبہ بہت پچھڑا اور غریب تھا۔ کھیتی باڑی اگرچہ یہاں کے لوگوں کی روزی روٹی کا خاص وسیلہ تھی، مگر حکومت کی طرف سے اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا جارہا تھا۔ اچھے بیج اور اچھی کھاد کی فراہمی کا کوئی انتظام نہیں تھا نہ کسانوں کو کسی طرح کا کوئی مشورہ مل پاتا تھا۔

غریبی میں گھرے یہ لوگ بہت تنگی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بچوں کے لیے کوئی اسکول تھا اور نہ دور دور کوئی کالج۔ لوگوں کے لئے روزگار کے بہت کم مواقع فراہم تھے اور یہ سب برطانوی حکومت کی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت تھا۔ انگریز چاہتے تھے کہ یہ علاقہ بدستور پسماندہ، کمزور اور محتاج بنا رہے۔

تعلیم

بادشاہ خاں جب پانچ سال کے ہوئے تو والدین نے پڑھنے کے لئے انہیں مقامی مسجد میں بھیج دیا۔ مسجد کے ملا کی کڑی نگرانی میں انہوں نے قرآن حفظ کرنا شروع کیا۔ انہیں تیس سورتیں زبانی یاد ہوگئیں۔ جب انہوں نے حافظے سے قرآن کی قرات شروع کی تو والدین نے خوش ہوکر مٹھائی تقسیم کی۔ مگر اس کم عمری میں بھی بادشاہ خاں نے صرف قرآن کو زبانی حفظ نہیں کیا۔ وہ اس کے مطلب اور معنی کو بھی سمجھتے جاتے تھے۔ بادشاہ خاں کہتے تھے کہ کٹھ ملا لوگ مذہب کی اصل روح کو نہیں سمجھتے ہیں، وہ بچوں کو سوال کرنے سے روکتے ہیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ بچے کسی طرح حفظ کرکے قرات سے پڑھ سکیں۔

بچپن میں ہی بادشاہ خاں محسوس کرنے لگے تھے کہ اپنے معبود کی صحیح پرستش خدمت خلق میں پوشیدہ ہے۔ بادشاہ خاں نے بعد میں پشاور کے میونسپل اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر ایڈورڈس میموریل مشن ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔

عملی زندگی

پشاور میں ایک انگریز افسر کی ماتحتی میں انگریزی فوج کی ایک ٹکڑی تعینات تھی۔ بادشاہ خاں کا ملازم برلی کاکا اس انگریز فوج کے عجیب و غریب قصے انہیں سنایا کرتا تھا۔ وہ کس طرح کا زرق برق فوجی لباس پہنتے ہیں، تلوار لٹکائے ان فوجیوں نے کیا کیا معرکے سر کئے، وغیرہ وغیرہ۔

نوجوان بادشاہ کے دل میں برطانوی فوج میں بھرتی ہونے کا شوق پیدا ہوا۔ انہوں نے برٹش انڈین آرمی کے کمانڈر ان چیف کو براہ راست ایک درخواست بھیج دی۔ اس میں سیدھے کمیشن افسر بنانے کی التجا کی گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بادشاہ خاں دسویں جماعت میں پڑھتے تھے اور میٹرک کا امتحان ہونے والا تھا۔

ایک دن انہیں ایک سرکاری خط ملا۔ اس میں لکھا تھا کہ براہ راست کمیشن میں بھرتی کی ان کی درخواست منظور کر لی گئی ہے اور وہ اگلی صبح مقامی بھرتی دفتر سے رابطہ قائم کریں۔ اس سے ان کا خوشی سے جھوم اٹھنا قدرتی بات تھی۔ انہوں نے امتحان دینے کا ارادہ ترک کر دیا اور اگلے ہی دن بھرتی افسر کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت ہندستان کی سب سے مایۂ ناز ریجمنٹ "دی گائیڈس" تھی۔ جو اس وقت ملتان میں تعینات تھی۔ 1857 کی بغاوت کے دوران اور اس علاقے کے دوسرے معرکوں میں اس ریجمنٹ نے بہت بہادری دکھائی تھی۔ بادشاہ خاں بھرتی افسر کے پاس گئے۔ انہیں فوراً چن لیا گیا۔ انگریزوں کو اور کیا چاہئے تھا کہ انہیں بادشاہ خاں جیسا آدمی فوج کے لئے مل جائے۔ ان کا تعلق صرف ایک اعلیٰ خاندان سے ہی نہیں تھا وہ خود بہت تندرست اور توانا تھے۔ ان کا قد 6 فٹ 3 انچ تھا۔

مگر بادشاہ خاں کا تعلق انگریزی فوج کے ساتھ زیادہ دن نہ چل سکا۔ ایک دن انہوں نے دیکھا کہ ایک انگریز لیفٹننٹ ان کے ایک ساتھی پٹھان افسر کو بری طرح لتاڑ

رہا ہے۔ ان کے ساتھی کا بس اتنا قصور تھا کہ وہ اپنے چھوٹے کٹے بالوں کے ساتھ بغیر صافہ باندھے ننگے سر آگیا تھا۔ انگریزوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا اور اس کے ساتھ بہت بدتمیزی سے پیش آئے۔

بادشاہ خاں پر اس واقعے کا گہرا اثر پڑا۔ ان کے ملازم برنی کاکا نے انگریزی فوج کے جو قصے سنائے تھے، اس سے ان کے دل میں فوج میں بھرتی ہونے کا خیال پیدا ہوا تھا، مگر انگریزوں کے طور طریقوں کا انہیں جو تجربہ ہوا اس سے ان کا دل اچاٹ ہوگیا۔ انہوں نے اسی دن انگریزی فوج سے الگ ہوجانے کا ارادہ کر لیا۔ ان کے باپ اور خاندان کے دوسرے لوگ اس سے کچھ پریشان بھی ہوئے کیونکہ پٹھانوں میں کسی فوج میں کمیشن افسری مل جانا بہت شان کی بات سمجھی جاتی تھی، مگر بادشاہ خاں فوج سے الگ ہوجانے کی اپنی ضد پر قائم رہے۔

بادشاہ خاں اب پھر پڑھائی کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے کیمپ بیل پور کے ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا، مگر وہاں کی آب و ہوا انہیں راس نہیں آئی۔ وہ قادیان چلے آئے۔ مگر یہاں بھی ان کا دل نہیں لگا اور انہیں علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ ایک ہائی اسکول میں غیر مقیم طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے۔

ان کے بڑے بھائی تعلیم سے فراغت پاکر انگلینڈ چلے گئے تھے، وہ چاہتے تھے کہ بادشاہ خاں بھی انگلینڈ آکر انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کریں، ان کے باپ نے اس تجویز کو پسند کیا۔ ان کے سفر اور کپڑے لتے اور روپے پیسے کے سبھی انتظامات کر لئے گئے۔ روانگی سے پہلے وہ اپنی ماں کی دعائیں لینے گئے، وہ ان سے لپٹ کر رونے لگیں، وہ انہیں جانے نہیں دے رہی تھیں۔ بادشاہ خاں نے اپنی ماں کو سمجھایا کہ وہ انگلینڈ جاکر اپنا علم بڑھانا چاہتے ہیں تاکہ وہاں سے لوٹ کر وہ لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے کام آسکیں۔ انہوں نے ماں کو یہ بھی سمجھایا کہ پٹھانوں کے درمیان انگریز تفرقہ پیدا کر رہے

ہیں اور غریبوں کو ستا رہے ہیں ۔ مگر ماں کا دل نوجوان بادشاہ خاں کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوا ۔ بادشاہ خاں اگرچہ دل سے انگلینڈ جانے پر آمادہ تھے مگر ماں کی آنکھ کے آنسو ان سے نہ دیکھے گئے اور انہوں نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ پوری زندگی ملک اور اپنے لوگوں کی خدمت میں لگا دیں گے۔ وہ اسے خدا اور انسانیت کی خدمت کا راستہ مانتے تھے۔

مادرِ وطن کی پکار

بادشاہ خاں اب مقامی لوگوں کی زندگی میں زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا، اس سے انہیں بھاری دھکا لگا۔ برطانوی حکومت پٹھانوں کو آہنی قانون کے شکنجے میں جکڑ کر رکھنا چاہتی تھی، "سرحدی جرائم قانون" کے تحت کسی بھی آدمی کو کبھی بھی گرفتار کر کے جیل میں ڈالا جاسکتا تھا ۔ ذرا بھی شک ہونے پر کسی کو کوڑے لگائے جاسکتے تھے ۔ چاہے اس شک کے لئے کوئی ثبوت ہو یا نہ ہو ۔

پٹھانوں کو انگریز آپس میں لڑاتے بھی رہتے تھے۔ انتقام کی آگ میں جل رہے پٹھانوں کے کسی ایک گروپ کا وہ ساتھ دیتے کبھی دوسرے گروپ کا ۔ پٹھانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے یہ سب کچھ کیا جاتا تھا ۔ تاکہ وہ انگریزوں کی حکمرانی میں کمزور اور محتاج بنے رہیں ۔

قبائلی لوگوں تک میں انگریزوں نے اپنی گھس پیٹھ بنالی تھی۔ برطانوی حکام ہی یہ طے کرتے تھے کہ جرگہ کی بیٹھک میں کون شریک ہو اور اس میں کیا فیصلہ کیا جائے۔

بغیر کسی ثبوت کے کسی کو بھی 14 سال کی سزا دی جاسکتی تھی اور اس کی اپیل کرنے کا حق بھی نہیں تھا ۔ یہ سخت گیر برطانوی قانون گو کہ مجرموں سے نپٹنے کے لئے بنائے گئے تھے، مگر ان کا استعمال عوام کی بھلائی کے کاموں میں لگے سیاسی کارکنوں

اور دوسرے بے قصور لوگوں کے خلاف کیا جاتا تھا ۔ بادشاہ خاں نے لوگوں کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی ۔ مگر جلدی ہی انہیں اور ان کے ساتھیوں کو جرائم کی روک تھام کرنے والے اس قانون کی دفعہ 40 کے تحت گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا ۔ پٹھانوں کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے انگریزوں نے ملاؤں اور مولویوں سے اچھے تعلقات بنا رکھے تھے، انہوں نے ملاؤں کے دلوں میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ پٹھانوں نے اگر تعلیم حاصل کرلی تو وہ زندگی کے رائج طور طریقوں سے کٹ کر الگ ہوجائیں گے۔ وہ تجارت اور دوسرے پیشوں کی طرف مائل ہوجائیں گے۔ انہوں نے ملاؤں کے کان یہ کہہ کر بھر دیئے تھے کہ پٹھانوں کے سماج میں انہیں جو عزت ملی ہوئی ہے وہ اس سے ختم ہوجائے گی۔ اس طرح ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ پٹھانوں کی اپنے بچوں کو اسکول بھیجنا ان کے مفاد میں نہیں ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ نوجوانوں کو نئی زندگی کی ہوا نہیں لگنی چاہیئے ۔

بادشاہ خاں اپنی سوانح میں لکھتے ہیں کہ " انہوں نے کس کس طرح ملاؤوں کو سمجھایا کہ تعلیم حاصل کرنے سے لوگ ترقی کریں گے اور مضبوط بنیں گے، وہ اس طرح بدیسی حکمرانوں سے نجات حاصل کر سکیں گے۔ مگر اس کا الٹا نتیجہ نکلا۔ ملاؤں نے حکومت سے ان کے خلاف شکایت کی اور کہا کہ پریشانی کی اصلی جڑ بادشاہ خاں ہیں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد کا اخبار " الہلال " بادشاہ خاں منگایا کرتے تھے، اس اخبار کے ذریعہ جمہوریت اور انصاف کے اصولوں کو پھیلایا جارہا تھا ۔ یہ اخبار انگریز حکمرانوں کی زیادتیوں کا بھانڈا پھوڑا کرتا تھا ۔ اس میں لوگوں سے غلامی کا طوق اتار کر آزادی کے لئے کام کرنے کی اپیل کی جاتی تھی۔ اس طرح کے کچھ اور اخبار بھی تھے۔ خان ظفر علی خاں کا اخبار " زمیندار " اور بجنور سے نکلنے والا "مدینہ" وغیرہ ۔ ان اخباروں میں یہ تاکید کی جاتی تھی کہ اچھا مسلمان ہونے کے لیے غیرملکی ظالموں سے لڑنا ضروری ہے۔ سی۔ آئی۔ ڈی۔

اور پولیس والوں کے پاس یہ اخبار منگانے والے لوگوں کی فہرست ہوتی تھی۔ ان لوگوں کو ایک ایک کرکے وارننگ دی جاتی تھی کہ وہ بادشاہ خاں اور ان کے ساتھیوں سے دور رہیں۔

مگر بادشاہ خاں کے پاس اچھے دوستوں کی کمی نہیں تھی۔ ان میں سے ایک اترپردیش کے دیوبند کے عظیم مذہبی عالم مولانا محمودالحسن تھے۔ وہ ملک کو غلامی سے نجات دلانے کے طور طریقوں پر انہیں مشورے دیتے تھے۔ بادشاہ خاں نے اس زمانے کے مشہور انقلابی رہنما مولانا عبید اللہ سندھی سے فتح پوری میں ملاقات کی۔ وہ سیف الرحمن سے بھی ملے جو آزادی کی لڑائی میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ یہ ساری ملاقاتیں بہت رازدارانہ انداز سے ہوئیں کہ پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی۔ والوں کو ان کی بھنک بھی نہیں لگ سکی۔

1912 میں 22 سال کی عمر میں بادشاہ خاں کی ایک حسین پٹھان لڑکی سے شادی ہوئی اور 1913 میں ان کے یہاں پہلا بیٹا خان عبدالغنی خاں پیدا ہوا۔

انگریزوں کی چال

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم لیگ اپنا دم خم دکھانے لگی تھی۔ بادشاہ خاں نے سر ابراہیم اور آغا خاں کی کئی تقریریں سنیں۔ ان مشہور دانشوروں کو برطانوی حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ ان کا مقصد ایک مذہبی حکومت قائم کرنے کے خیال کو پھیلانا تھا۔ بادشاہ خاں کو شروع میں یہ گمان تھا کہ مسلم لیگ بھی الگ سیاسی پارٹی ہے جو برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلم لیگ شاید پٹھانوں کی بہتری کے مقصد میں مدد پہنچا سکے۔ وہ اس پارٹی کی طرف جھکے مگر جلدی ہی ان کا گمان غلط ثابت ہوا اور انہیں احساس ہوا کہ مسلم لیگ کے لیڈر انگریزوں کے

اشارے پر چلتے ہیں۔ ان کے سارے پروگراموں اور سرگرمیوں کا خاکہ انگریزوں کی مرضی سے بنتا ہے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ مسلم لیگ کا اصل مقصد مسلمانوں کو آزادی کی لڑائی کے اصلی دھارے سے الگ تھلگ رکھنا اور انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کرنا ہے۔

بادشاہ خاں نے اس راستے کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا وہ بہت مایوس اور بد دل سے ہوگئے۔ انگریز حکمراں برابر ان کے کاموں میں خلل ڈالتے رہتے تھے، ان کا ساتھ دینے والوں کو جیل میں ٹھونس دیا جاتا تھا۔

جیل کی اذیتیں

بادشاہ خاں نے جیل میں کافی اذیتیں اٹھائیں، جیل کی کوٹھری میں ہاتھ پیر زنجیروں سے جکڑ کر انہیں کھڑے رہنے پر مجبور کیا جاتا۔ کئی کئی دن انہیں کھانا پانی نہیں دیا جاتا تھا۔ ان کے ساتھیوں کو لا لاکر ان کی حالت دکھائی جاتی تاکہ وہ عبرت حاصل کریں اور ان کی تحریک سے اپنے کو دور رکھیں مگر اس طرح کی تکلیفوں نے بادشاہ خاں کے حوصلوں کو اور بڑھا دیا۔ ان میں اپنے کام کو جاری رکھنے کا نیا ولولہ پیدا ہوا۔ جیل کی دیواروں میں قید بادشاہ خاں نے اپنی قوم کے لوگوں کی لڑائی کو اور شدت سے جاری رکھنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ دوسری طرف برطانوی حکام تھے جو ان کے حوصلوں کو توڑنے کے درپے تھے۔

بادشاہ خاں کو کال کوٹھری میں ڈال دیا گیا۔ رات دن انہیں ایک اندھیری ٹھنڈی کوٹھری میں بند رکھا گیا۔ کوئی آدمی نہ ان کے قریب آسکتا تھا اور نہ ان سے بات کر سکتا تھا۔ ان کے ہاتھوں پیروں کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا اور گلے میں لوہے کا طوق ڈال دیا گیا۔ اس پر بھی انہیں ہر روز بارہ کلو آٹا پیسنا پڑتا تھا۔ انہیں بہت بدمزہ اور روکھا

پھیکا کھانا دیا جاتا تھا۔

جیل کے افسر ان سے یہ ضمانت مانگتے تھے کہ وہ قومی بھلائی کے کام کرنے کے خیال کو ترک کر دیں۔ انہیں دو مہینے تک جیل میں اسی طرح ڈالے رکھا گیا۔ اس کے بعد انہیں ڈیرہ اسماعیل خاں کی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ صوبہ سرحد کی اس ضلع جیل میں عام مجرموں کو رکھا جاتا تھا۔

یہاں بادشاہ خاں نے مجرموں پر اپنا زبردست اثر ڈالا۔ ان لوگوں کو چھوٹے موٹے جرم میں جیل میں ڈالا گیا تھا۔ یہ سبھی ان پڑھ اور غریب تھے۔ یہ لوگ بادشاہ خاں کو گھیرے رہتے اور ان کی باتیں سنتے۔ انہوں نے ان لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ آپس میں لڑنا جھگڑنا بند کریں، گناہوں سے توبہ کرلیں اور اپنے ساتھیوں کے کام آنے کا عزم پیدا کریں۔ بادشاہ خاں نے جیل کے قیدیوں پر جو اثر ڈالا اس سے جیل کے حکام ہکا بکا رہ گئے۔ ان لوگوں کو شک گذرا کہ بادشاہ خاں ان لوگوں کو سیاسی طور پر ورغلا رہے ہیں۔ جلدی ہی انہیں ڈیرہ غازی خاں کی جیل بھیج دیا گیا۔ پشاور کے جنوب میں قائم یہ جیل سیاسی قیدیوں کو حراست میں رکھنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ قید کے دوران بادشاہ خاں کی صحت کافی گر گئی تھی، ان کا وزن 20 کلو گھٹ گیا تھا اور کئی بیماریاں لگ گئی تھیں۔ ڈیرہ غازی خاں میں سیاسی قیدیوں کے علاوہ کچھ عام قیدی بھی تھے۔ وہاں بھی انہوں نے قیدیوں پر اسی طرح اثر ڈالا جیسا وہ ڈیرہ اسماعیل خان کی جیل میں کر چکے تھے۔ یہاں بھی یہی عالم تھا کہ جو کوئی انہیں دیکھنے یا ملنے آتا اس کی دنیا ہی بدل جاتی۔ ان میں ساتھیوں کی مدد، ملک سے محبت اور قربانی کا جذبہ پیدا ہوجاتا۔

جیل سپرنٹنڈنٹ نے انہیں رسی بٹنے کا کام سونپا۔ بعد میں سوت کاتنے کا چرخہ بھی دیا گیا۔ جیل میں انہوں نے باریک سوت کاتنا سیکھ لیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ کتائی کرتے وقت دماغ کو یکسوئی مل جاتی ہے۔ چرخہ کاتنے کے دوران انہیں عام

آدمیوں کے مسائل پر سوچنے کا کافی وقت مل جاتا۔

ڈیرہ غازی خاں کی جیل میں وہ جب تک رہے برابر یہ غور و فکر کرتے رہے کہ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں پٹھانوں کے لیڈر کس طرح اپنے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ وہاں کا جیلر خان علاء الدین خاں انگریزوں کی نظر میں اچھا بننے کے لئے بادشاہ خاں کے ساتھ بہت سختی سے پیش آتا۔ ان کی صحت ایک بار پھر خراب رہنے لگی۔

جیل میں ان کے ساتھی بادشاہ خاں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ایک ہندو سے انہوں نے "شانتی منتر" سیکھا۔ انہوں نے یہاں وہ نعرہ بھی سنا کہ "سر جاوے تو جاوے میرا سکھ دھرم نا جاوے" انہوں نے محسوس کیا کہ سبھی مذہب سچائی کا راستہ دکھاتے ہیں۔ امن، بھائی چارے اور خدمت خلق کا پیغام دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اسلام کی باتیں بتائیں اور ہر ایک کو تاکید کی کہ وہ اپنے اپنے مذہب پر اچھی طرح قائم رہے۔ جیل میں کبھی کبھار انہیں کسی رشتہ دار کا خط ملا کرتا تھا۔ ان سے ان کو پتہ چلا کہ برطانوی حکومت نے جلسے جلوسوں پر پابندی لگا دی ہے اور لوگوں کو دہشت زدہ کیا جارہا ہے۔ بادشاہ خاں نے ان حالات میں مسجدوں میں میٹنگ کرنے کی بات سوچی۔ جہاں لوگ نماز کے لئے جمع ہوتے تھے۔ خفیہ طریقے سے یہ بات سیکڑوں مسجدوں تک پہنچا دی گئی۔ عام آدمی ان میٹنگوں میں شریک ہونے لگے۔ بادشاہ خاں کی طرف سے لوگوں کو ہدایتیں ملنے لگیں۔ ان جلسوں میں زیادہ تر نوجوان چھائے رہتے تھے۔ ان کو اس بات کی خوشی تھی کہ ان کا لیڈر جیل میں رہتے ہوئے بھی ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔

غفار۔۔ غفار

اس دوران 1920 میں خان عبدالغفار خاں کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ ان کی ماں

انہیں بہت چاہتی تھیں اور انہوں نے ہی ان کو اپنے قریب رکھنے کی خاطر ملک کے باہر جانے سے روک دیا تھا۔ ان کی ماں کو رہ رہ کر یہ بات ستاتی تھی کہ ان کا بیٹا مسلسل جیل کی اذیت اٹھا رہا ہے۔ مرتے وقت ان کی زبان پر آخری لفظ "غفار۔ غفار" ہی تھے۔ وہ پکارتیں "غفار تم کہاں ہو"؟ "وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا۔" بادشاہ خاں کو یاد کرتی ہوئی وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ بادشاہ خاں کو ماں کے مرنے کی خبر فوراً نہیں دی گئی۔ بعد میں اخبار سے انہیں یہ خبر ملی۔

فخرِ افغان

انہیں ایک دوسرے جیل میاں والی میں منتقل کر دیا گیا۔ اس جیل میں بس کال کوٹھریاں ہی کال کال کوٹھریاں تھیں، کہیں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں قیدی چل پھر سکیں۔

1924 میں ان کی تین سال کی سزا کی مدت پوری ہونے پر انہیں رہا کر کے سپاہیوں کی نگرانی میں اپنے گاؤں پہنچا دیا گیا۔ ان کی رہائی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ بچے، بوڑھے، جوان ہزاروں کی تعداد میں اپنے محبوب رہنما کے خیر مقدم کے لئے نکل پڑے۔ ایک بڑے جلسے میں عوام نے انہیں فخرِ افغان کا خطاب دیا۔

اسی جلسے میں انہوں نے اپنی وہ مشہور تقریر کی جس نے پٹھانوں میں جوش کی لہر پیدا کر دی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں شیر کے بچے اور بھیڑوں کا قصہ سنایا کہ "ایک شیرنی جو بچہ دینے والی تھی" بھیڑوں کا ایک جھنڈ دیکھ کر ان پر ٹوٹ پڑی۔ اس دوڑ جھپٹ میں اس کے بچہ پیدا ہوگیا مگر شیرنی مر گئی۔ شیر کا بچہ بھیڑوں کے جھنڈ میں اکیلا رہ گیا۔ ایک بھیڑ نے شیر کے اس بچے کو پال لیا۔ بھیڑوں کے بیچ پلنے والا یہ شیر بچہ بھیڑوں کی طرح ممیانے لگا۔ ایک دن دور کے جنگل سے ایک شیر وہاں آیا اور بھیڑوں

پر حملہ کر دیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بھیڑوں کے درمیان ایک شیر کا بچہ اچھل کود کر رہا ہے اور بھیڑوں کی طرح ممیا رہا ہے۔ شیر نے اس پلے کو پکڑ لیا۔ وہ اسے ایک تالاب کے پاس لایا اور پانی میں شیر بچے کو اس کا عکس دکھاکر کہنے لگا کہ دیکھو تم بھیڑ نہیں شیر بچہ ہو۔ تم بھیڑوں کی طرح ممیایا مت کرو بلکہ شیر کی طرح گرجو اور دھاڑو۔"

بادشاہ خاں نے اتنا قصہ سناکر پٹھانوں کو مخاطب کیا کہ تم بھیڑ نہیں ہو۔ تم شیر ہو محکومی میں پلنے بڑھنے کی وجہ سے تم دبے ہوئے ہو۔ تم بھیڑوں کا انداز چھوڑو اور شیروں کی طرح گرجو اور دھاڑو۔

بادشاہ خاں کی اس تقریر کا لوگوں پر جادوئی اثر ہوا۔ پولیس کے ایک رپورٹر نے یہ سب باتیں نوٹ کر لی تھیں اور ایسا سمجھا جا رہا تھا کہ برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت بھڑکانے کے جرم میں انہیں جلدی گرفتار کرلیا جائے گا۔

حج کا سفر

بادشاہ خاں نے اپنی بڑی بہن اور بیوی کے ساتھ حج کرنے مکہ جانے کا ارادہ کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انگریز حکومت جلدی ہی ان کے خلاف کارروائی کرے گی۔ اور ایک مسلمان کی حیثیت سے وہ اس سے پہلے حج کا فریضہ ادا کرنا چاہتے تھے۔

ایک دن مکہ میں زری کے کام کا عمامہ پہنے ایک داڑھی والا آدمی ان کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ "میں تمہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کے بال اور پتھر پر ان کے قدم کے نشان کی زیارت کرا سکتا ہوں۔"

بادشاہ خاں کا جواب تھا کہ "میں یہاں مقدس تبرکات کی زیارت کرنے نہیں آیا ہوں، میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت اور تحمل کا جلوہ دیکھنے آیا ہوں۔ جنہوں نے طائف والوں کی مدد کے لئے مکہ سے ریگستانی راستوں کا دشوار سفر کیا۔ مگر

طائف والے جب ان سے منحرف ہوگئے تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں دعا کی کہ "اے اللہ تو ان کی رہنمائی کر اور انہیں سچا سیدھا راستہ دکھا۔"

بادشاہ خاں اپنی بیوی کے ساتھ مدینہ سے یروشلم گئے۔ یہاں گویا ان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ان کی بیوی پتھر کے زینے سے گر کر بری طرح زخمی ہوگئیں اور جلدی ہی انتقال کر گئیں۔ بادشاہ خاں اس سے بہت غم زدہ ہوئے۔ مگر اس حادثے سے غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرنے کا ان کا جذبہ اور بڑھ گیا۔ واپسی سفر میں وہ مغربی ایشیا کے سبھی مشہور اور تاریخی مقامات پر گئے۔ انہوں نے لیبیا، سیریا، اور عراق کا سفر کیا۔ وہ نجد سے کربلا ہوتے ہوئے بغداد گئے۔ اور پھر وطن واپس لوٹے۔

پختونوں کی آواز

بادشاہ خاں کو احساس تھا کہ پختونوں میں بیداری پیدا کرنے کے لئے ان کے درمیان معلومات اور صحیح اور سچے خیالات پھیلانے کا انتظام کرنا ہوگا۔ بادشاہ خاں نے پشتو زبان میں ایک اخبار "پختون" نکالا۔ یہ اخبار مئی 1928 میں نکلنا شروع ہوا۔ وہ سمجھتے تھے کہ پختونوں کے دل و دماغ میں اترنے کے لئے پشتو زبان کا سہارا لینا ضروری ہے۔ یہ اخبار جلدی ہی کافی مقبول ہوگیا۔ ملک کے اندر اور باہر اس کے خریدار بننے لگے۔ افغانستان میں اسی طرح کا ایک اور اخبار "جاگ پختون" نکالا گیا۔

اپنی زبان میں بادشاہ خاں کے خیالات کو پڑھ کر لوگ بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ اس زبان سے انہیں دلی لگاؤ تھا۔ مگر انگریز حکومت نے ایسی تدبیریں شروع کیں کہ اخبار کی اشاعت رک جائے۔ برطانوی حکام نے ملاؤں اور دوسرے مذہبی رہنماؤں کو اس اخبار کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ اخبار کے خلاف آواز اٹھنے پر حکومت کو مداخلت کا موقع مل گیا اور اس اخبار پر پابندی لگا دی گئی۔ بادشاہ خاں اپنے ضلع میں اس

اخبار کو چلانے کی کوشش میں لگے رہے ۔

بادشاہ خاں 1927 میں لکھنو گئے ۔ جہاں کانگریسی لیڈروں کی ایک میٹنگ ہو رہی تھی۔ وہاں انہوں نے مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو سے ملاقات کی۔ بادشاہ خاں کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب پنڈت نہرو کے شناسا تھے۔ انہوں نے ان کے لئے تعارفی خط لکھ دیا تھا ۔ پنڈت نہرو کے ساتھ افغانستان کے بارے میں ان کی لمبی بات چیت ہوئی ۔

اسی میٹنگ میں بادشاہ خاں پر یہ تاثر پڑا کہ مہاتما گاندھی پنڈت نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے قومی رہنما ہی ان کے سچے ہمدرد اور دوست ہیں۔ یہ بات ان کے دل میں بیٹھ گئی کہ ہندوستان کی آزادی کے سورماؤں کے ساتھ مل کر ہی پختون عوام کی بہبود کا کام موثر طریقے سے کیا جاسکتا ہے ۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ مہاتما گاندھی ، پنڈت نہرو اور مولانا آزاد جیسے رہنما ہندوستان کے لوگوں میں آزادی کا ولولہ پیدا کر رہے ہیں۔ وہ ہندوستان والوں کے دلوں میں امن، انصاف، صداقت اور خدمت کا جذبہ پیدا کررہے ہیں، لوگوں میں قومی بیداری پھیل رہی ہے۔ یہ رہنما ملک میں سماجی، معاشی اور سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ بادشاہ خاں اس بات کے قائل ہوگئے کہ اہنسا اور اتحاد کے جذبے سے ہی فتح حاصل کی جاسکتی ہے۔

اپنے گاؤں عثمان زئی لوٹنے پر بادشاہ خاں نے کئی بڑے جلسے، عوامی رابطے کے سارے انہوں نے عدم تشدد کے ذریعہ مزاحمت کرنے کا پیغام پھیلایا۔ لوگوں کو بتایا کہ "میں ابھی ابھی ہندوستان سے لوٹا ہوں وہاں ایک نئے انقلاب کی آمد آمد ہے۔ مجھے وہاں کے لوگ، چاہے مرد ہوں یا عورت، اپنے ملک اور ہم وطنوں کی خدمت کے لئے جی جان سے تیار نظر آئے ۔ آپ اپنے وطن اور قوم کو اگر خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں تو ذاتی

مفاد سے اوپر اٹھیں اور معاشرے کے مفاد کی بات سوچیں۔ "

انہوں نے مغرب کے خوشحال ملکوں کی مثالیں دیں کہ وہاں کے لوگوں نے اپنے ذاتی آرام و آسائش کو ملک کی فلاح اور بہبود کے لئے قربان کیا تھا۔ وہ لوگوں کو یاد دلاتے تھے کہ اگر ملک خوشحال ہوگا تو اس میں سبھی کا بھلا ہے۔ ہر مرد، عورت اور بچہ ملک کی خوشحالی میں حصہ دار ہوگا۔ خوشحالی جنت سے ٹپک کر نہیں آتی۔ وطن کی محبت سے سرشار لوگوں کی قربانی سے ہی خوشحالی آتی ہے۔

بادشاہ خاں پختون سماج کو اس کی سماجی برائیوں سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ انتقام لینا، قبیلوں کے آپسی جھگڑے، عورتوں کے ساتھ زیادتی کرنا، کھانے اور کپڑوں پر فضول خرچی اور بڑے پیمانے پر مقدمے بازی ہمارے سماج کی برائیاں ہیں۔ یہ برائیاں پختونوں کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔ انہوں نے پختونوں میں بھائی چارہ، خدا ترسی، خدمت اور سچائی کا جذبہ پروان چڑھانے کی کوشش کی۔

خدائی خدمت گار

بادشاہ خاں نے 1929 میں ایک انجمن قائم کی، جو تاریخ میں "خدائی خدمت گار" تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔

خدائی خدمت گار وہی شخص بن سکتا تھا جو یہ عہد کرے کہ "میں خدائی خدمت گار ہوں، خدا کو کسی بندے سے خدمت لینے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے اس کے بندوں کی خدمت کرنا ہی معبود کی سچی بندگی ہے۔

اس لئے میں عہد کرتا ہوں کہ :

خدا کے نام پر انسانیت کی خدمت کرتا رہوں گا۔

- میں تشدد سے دور رہوں گا اور انتقام لینے سے پرہیز کروں گا۔"

" میں ان لوگوں کو معاف کرنے کا وعدہ کرتا ہوں، جو مجھے ستاتے اور مجھ سے بے رحمی کا سلوک کرتے رہے ہیں۔

" عہد کرتا ہوں کہ میں لڑائی جھگڑے سے دور رہوں گا۔ اور دشمنی پیدا کرنے سے پرہیز کروں گا۔

" عہد کرتا ہوں کہ میں ہر پٹھان کو اپنا بھائی سمجھوں گا۔

" عہد کرتا ہوں کہ میں سماج دشمن رواجوں سے دور رہوں گا۔

" سادہ اور پاک زندگی گذاروں گا۔ اور ہر طرح کے شر سے بچوں گا۔

" عہد کرتا ہوں کہ میں زندگی میں اچھے طور طریقے اختیار کروں گا۔ اور کاہلی کی زندگی گذارنے سے بچوں گا۔

" عہد کرتا ہوں کہ ہر دن کم سے کم دو گھنٹے سماجی کاموں میں لگاؤں گا۔

بادشاہ خاں کی رہنمائی میں خدائی خدمت گاروں کی یہ تحریک پٹھانوں کی زندگی پر پوری طرح چھا گئی۔ اس سے لوگوں میں احترام اور مروت کا جذبہ بیدار ہوا۔ آپسی انتقام کی آگ میں جلنے والے اور ہر وقت تشدد پر آمادہ لوگوں کی کایاپلٹ ہونے لگی۔ وہ اصول پرست، خدا ترس، نظم و ضبط کے پابند، خدمت اور رحم کے جذبے سے سرشار ہوتے گئے۔ بغض اور عداوت کے جذبے سے دور ہو کر یہ لوگ بڑی بڑی قربانیاں دینے پر آمادہ نظر آنے لگے۔

خدائی خدمت گاروں کی تحریک سرحدی صوبے کے سبھی علاقوں میں پھیلتی گئی۔ اندرونی قبائلی علاقوں میں اس تحریک نے لوگوں میں ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا۔

مکمل سوراج

دسمبر 1929 میں کانگریس کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا۔ بادشاہ خاں نے اس

اجلاس میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا۔ سرحدی صوبے کے مختلف گاؤں سے ہزاروں لوگ ان کے ساتھ ہولیے ۔

اسی اجلاس میں پٹھان خدائی خدمت گاروں نے ملک کی مکمل آزادی کے لئے کام کرنے کا عہد لیا ۔ بیاس ندی کے کنارے منعقد اس اجلاس میں کانگریس نے مکمل سوراج کی قرارداد پاس کی ۔ کانگریس لیڈروں کی طرف سے بادشاہ خاں کو یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ کانگریس پٹھانوں کی آزادی کی حمایت کرے گی ۔

لاہور اجلاس سے واپس آنے پر بادشاہ خاں نے خدائی خدمت گاروں کی تحریک میں اور تیزی لانے کے لئے گاؤں گاؤں کا دورہ کیا۔ انگریزی حکومت کے حکمرانوں پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی۔ سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکی ۔

حکومت کے ظالم اہل کاروں نے عام آدمی کو بادشاہ خاں سے دور رکھنے کی بھرپور کوشش کی ۔ مگر انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لوگوں کے دلوں سے برطانوی حکومت کا خوف نکل چکا ہے۔ ان میں زبردست ہمت پیدا ہوگئی ہے۔ انہیں اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ ان کا کیا حشر ہوگا ۔ انہوں نے تو ہر طرح بادشاہ خاں کا ساتھ دینے اور خدائی خدمت گار تحریک کو آگے بڑھانے کی ٹھان رکھی ہے۔ اس تحریک کی قدروں کا انہیں بہت پاس تھا۔ بادشاہ خاں اور ان کے مخلص ساتھی تحریک کو پھیلانے میں رات دن ایک کیے ہوئے تھے۔ جوں جوں زیادہ سے زیادہ لوگ اس تحریک میں شامل ہوتے گئے، برطانوی حکومت کی فکر اور پریشانی بھی بڑھتی گئی۔

جلدی ہی سرحدی صوبے کے چیف کمشنر کا یہ پیغام آیا کہ خدائی خدمت گار تحریک بند کر دی جائے۔ بادشاہ نے اس کا جواب دیا کہ یہ پوری طرح معاشرتی یا سماجی تحریک ہے جس کا حکومت کو برا نہیں ماننا چاہیے۔ یہ تحریک صرف لوگوں کی خدمت اور

ان کی بھلائی کے کاموں میں لگی ہوئی ہے۔ اسکولوں کی عمارتیں بنوانے، لوگوں کو پڑھانے، لوگوں کے کھانے کپڑے اور دواؤں کا انتظام کرنے سے ہی اس تحریک کا سروکار ہے۔ یہ ایسے کام ہیں جو اصل میں حکومت کو خود کرنے چاہیئے تھے۔ اگر حکومت یہ سب کام نہیں کرسکتی ہے تو اسے خدائی خدمت گاروں کو ایسے سماجی کام سے روکنا بھی نہیں چاہیئے۔

بادشاہ خاں کی اس بات پر یقین نہیں کیا گیا۔ یہ تحریک کسی طرح برطانیہ حکومت کے خلاف نہیں ہے۔ عثمان زئی میں ایک بڑے جلسے کے بعد بادشاہ خاں جب پشاور جانے کی تیاری کر رہے تھے، انہیں اچانک گرفتار کر لیا گیا۔ انہیں چار سزا لایا گیا۔ مگر خدائی خدمت گار تحریک کا رکنا تو دور کی بات رہی، اس گرفتاری سے لوگوں میں اشتعال پھیل گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ گھروں سے نکل پڑے اور بادشاہ خاں کی گرفتاری پر حکومت مخالف نعرے لگانے لگے۔ ان لوگوں نے اعلان کر دیا کہ جب تک ان کے محبوب رہنما کو رہا نہیں کیا جاتا، وہ اپنی لڑائی جاری رکھیں گے۔ ہزاروں لوگ اپنا مقدس فریضہ مانتے ہوئے خدائی خدمت گار تحریک میں شامل ہوگئے۔

اس گرفتاری سے لوگوں میں اچانک جو اشتعال پیدا ہوا تھا، اسے دبانے کے لئے حکمرانوں نے تیاری شروع کر دی۔ بکتربند گاڑیوں میں برطانوی فوجوں کی ٹکڑیاں پہنچ گئیں۔ مگر لوگ اس سے بالکل خوف زدہ نہیں ہوئے۔ بادشاہ خاں کی محبت نے لوگوں کے دلوں سے خوف مٹا دیا تھا۔ وہ آزادی کے بہادر سورما بن چکے تھے۔ فوج کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لئے نوجوان سینہ تان کر ڈٹ گئے۔ وہ کاندھے سے کاندھا ملاکر زنجیر بن کر کھڑے ہوگئے۔ بکتربند گاڑیاں ان کے اوپر سے گذر گئیں، بہت سے محب وطن مارے گئے، دیکھتے ہی دیکھتے برطانوی فوج نے گولی چلانی شروع کر دی۔ بہت سے سیدھے سادے غریب لوگ آزادی اور عزت کے لئے قربان ہوگئے۔ وہ بہادروں کی

موت مرے۔ بادشاہ خاں نے ان میں قربانی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ انہوں نے لوگوں کی اس قربانی کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ مرنے والوں میں ہندو، مسلمان، سکھ سبھی شامل تھے۔ انہوں نے حکومت برطانیہ کو دکھا دیا کہ آزادی اور انصاف سے محبت انہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔

حکومت جتنا دبانے کی کوشش کرتی، یہ تحریک اتنی ہی تیزی سے پھیلتی جاتی۔ حکام نے تحریک کو دبانے کے لئے وحشیانہ کارروائی کی۔ پولیس نے جگہ جگہ گولیاں چلائیں۔ ہزاروں لوگ گرفتار کئے گئے مگر ان سے لوگوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔

بادشاہ خاں کی ترغیب سے یہ تحریک اہنسا کے اصول پر قائم رہی۔ اس زمانے میں بھی جب بادشاہ خاں جیل میں تھے، اس تحریک نے اہنسا کا دامن نہیں چھوڑا۔ حکومت لوگوں کو زور زبردستی اور تشدد سے خوفزدہ کرنے کی کوشش میں لگی رہی۔ مگر خدائی خدمت گار اہنسا کے اصول سے نہیں ہٹے۔ ایک موقع پر چار سدّا میں جہاں بادشاہ خاں کو حراست میں رکھا گیا تھا ہزاروں لوگ جمع ہوکر حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے لگے۔ یہ لوگ بہت اشتعال میں تھے مگر بادشاہ خاں کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب نے لوگوں کو خطاب کیا اور وہاں تشدد کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔

جیل میں ایک نئی زندگی

بادشاہ خاں کی حمایت میں سیاسی کارکنوں کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے حکام نے بادشاہ خاں کو پشاور کی مردان جیل میں ڈال دیا۔ انہیں ضلع مجسٹریٹ خان بہادر غازی خاں کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ عدالت نے سرحدی جرائم قانون کے تحت انہیں تین سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔

انہیں پنجاب کی گجرات جیل لایا گیا۔ اس جیل میں صوبہ سرحد پنجاب اور دلی کے بہت سے سیاسی قیدی موجود تھے۔ یہ سیاسی قیدی سبھی مذہب کے تھے۔ بادشاہ خاں نے دیکھا کہ یہ لوگ سیاسی معاملات میں کافی بیدار ہیں اور وہ بہت سے معاملات میں ان سے مفید تبادلہ خیال کر سکتے ہیں۔

سیاسی قیدیوں نے وہاں اپنی ایک انجمن بنا لی۔ اس میں ان باتوں پر غور کیا جاتا تھا کہ آزادی ملنے کے بعد ملک کا نظم و نسق کیسے چلایا جائے گا اور وہ خود کس طرح اس میں اپنی ذمہ داریاں نبھائیں گے۔ ان لوگوں نے ایسے موضوعات پر بہت سی کتابیں حاصل کیں اور بحث و مباحثے شروع کیے گئے۔ وہاں مختلف مذہبوں کے لوگ بھی تھے جنہوں نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے مذہب سے متعارف کرایا۔

بادشاہ خان بھگود گیتا اور قرآن کی کلاس لیا کرتے تھے۔ اس سے مسلمان قیدیوں میں بھگود گیتا اور ہندو قیدیوں میں قرآن شریف کا احترام پیدا ہوا۔ بادشاہ خاں کی رہنمائی نے لوگوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ سارے مذہب کا ایک ہی پیغام ــــ محبت صداقت اور خدمت ہے۔

بادشاہ خاں جیل کے اس زمانے کو اکثر یاد کرتے تھے جو ان کے لئے بہت خوشگوار زمانہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کسی بھی جیل خانے میں انہیں اتنی اچھی زندگی گذارنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ کہتے تھے کہ وہاں ہونے والے بحث مباحثے کا میری زندگی پر گہرا اثر پڑا۔

بہادری کے کارنامے

جب لیڈر جیل میں تھے اس وقت عام آدمی حکومت کے ظلم کا شکار بنائے جا رہے تھے۔ صوبہ سرحد پر برطانوی پولیس اور فوج نے لوہے کا شکنجہ کس رکھا تھا۔ کسی کو باہر

جانے یا باہر سے اندر آنے کی اجازت نہیں تھی اور صوبے سے باہر اس کی شکایت بھیجنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ دنیا اس بات سے بے خبر تھی کہ سرحد کے امن پسند لوگوں پر کیا ظلم ڈھائے جارہے ہیں۔

بادشاہ خاں کے دو ساتھی۔ میاں جعفر خاں اور میاں عبداللہ شاہ کسی طرح حکام کی آنکھ بچاکر نکل آئے۔ وہ جیل میں بادشاہ خاں سے ملے۔ انھوں نے صوبہ سرحد کے حالات سے انہیں باخبر کیا کہ کس طرح فوج اور پولیس خدائی خدمت گاروں پر ظلم توڑ رہی ہے۔ خدائی خدمت گار کے دفتر کو توڑ پھوڑ کر تہس نہس کر دیا گیا ہے۔ بادشاہ خاں کے بیٹے ولی خاں جو 14 سال کے تھے کس طرح پولیس کی زد و کوب سے بچے۔ خدائی خدمت گاروں کے ٹھکانوں سے جو بھی کاغذات اور دستاویز ملتے، فوج والے انہیں جلا دیتے۔ گاؤں میں پولیس والے خدائی خدمت گاروں کا یونیفارم لال قمیص پہنے جس کسی کو دیکھتے گرفتار کر لیتے۔ ان کی اس وقت تک پٹائی کی جاتی جب تک وہ بے ہوش نہیں ہوجاتے تھے۔

مگر اس سخت گیری سے خدائی خدمات گاروں کی تحریک کو کچلنے کا مقصد پورا نہیں ہوا۔ اس ظلم و ستم نے لوگوں میں نئی ہمت پیدا کر دی۔

ایک بار پٹھانوں کے ایک گاؤں میں چھاپہ مار کر خدائی خدمت گاروں کو پکڑ کر پٹائی کی گئی۔ ایک فوجی افسر نے ہتک آمیز لہجے میں پوچھا کہ اس گاؤں میں کیا اور کوئی خدائی خدمت گار رہ گیا ہے۔ وہاں موجود ایک شخص محمد عباس خاں یہ سنتے ہی دوڑا ہوا اپنے گھر پہنچا اور قمیص پر لال رنگ ڈال کر خود اور اپنے نوکروں کو ساتھ لے کر وہاں پہنچا کہ "ہم سب خدائی خدمت گار ہیں۔"

بادشاہ خاں لکھتے ہیں کہ "عباس خاں اس وقت تک خدائی خدمت گاروں میں شامل نہیں تھا۔ مگر حب الوطنی کے جذبے اور لوگوں سے ہمدردی کے احساس نے

اس کے اندر انگریزوں کا اس طرح سامنا کرنے کی ہمت پیدا کر دی تھی۔"

حکومت نے خدائی خدمت گاروں کو دبانے کے لئے کئی طرح کے ہتھکنڈے استعمال کئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مقامی لوگ تحریری دستاویزوں کو کافی اہمیت دیتے ہیں۔ حکومت نے ایسے بیانوں پر لوگوں کے انگوٹھے کے نشان حاصل کرنے کی کوشش شروع کی جس میں خدائی خدمت گار تحریک سے اپنی بے تعلقی ظاہر کرنے کی بات لکھی ہوئی تھی۔ یہ لوگ گاؤوں میں جاتے اور لوگوں کو باہر نکال کر کسی جگہ جمع کرلیتے اور بیان پر انگوٹھا لگانے کے لئے دباؤ ڈالتے۔ لوگوں کی پٹائی کی جاتی مگر کیا مجال کہ لوگ ٹس سے مس ہوں۔ دن دن بھر انہیں دھوپ میں بٹھائے رکھا جاتا۔

ایک دن ایک پٹھان اس کاغذ پر انگوٹھا لگانے کو راضی ہوگیا۔ انگوٹھا لگاکر اسے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ گھر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی لکڑی کی ایک موسلی سے پیٹ پیٹ کر کپڑے دھو رہی ہے۔ اس نے شوہر سے پوچھا کہ تم اکیلے کیسے آگئے، جبکہ دوسرے لوگ ابھی دھوپ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کے یہ کہنے پر کہ حاکم نے اسے چھوڑ دیا ہے اسے شک ہوا۔ وہ اس کا انگوٹھا دیکھنے لگی جس پر روشنائی لگی ہوئی تھی، بس پھر کیا تھا وہ موسلی لے کر اس پر ٹوٹ پڑی اور کہنے لگی کہ " اگر تو اپنے کیے پر شرمندہ نہیں ہے تو نہ ہو، مگر میں کسی ایسے آدمی کے ساتھ نہیں رہ سکتی جو اپنے آپ کو خدائی خدمت گار سے الگ سمجھتا ہو۔"

وہ شخص دوڑ کر پھر وہیں پہنچ گیا جہاں دوسرے لوگوں کو بٹھا رکھا گیا تھا۔ برطانوی حکومت سے مزاحمت کرنے کا جذبہ اس وقت لوگوں میں اتنا ہی شدید تھا۔

آزادی کی لڑائی سے تال میل

بادشاہ خاں اور ان کے ساتھیوں کو احساس تھا کہ جب تک وہ جیل میں رہیں

گے سرحد کے لوگ برطانوی حکومت کے خلاف اسی طرح مزاحمت کرتے رہیں گے۔ اور انگریزی فوج اور پولیس لوگوں پر ظلم ڈھاتی رہے گی۔ ہوسکتا ہے کہ حکام اس طرح تحریک کو دبانے میں کامیاب ہوجائیں۔

بادشاہ خان نے اب انڈین نیشنل کانگریس کا رخ کیا اور ان سے مدد کی یقین دہانی حاصل کی۔ خدائی خدمت گار تحریک نے ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں شامل ہونے کا عہد لیا۔

ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں شامل ہونے کے خدائی خدمت گاروں کے عزم کی تصدیق پٹھانوں کے ایک جرگے میں کر دی گئی۔ پختونوں کے اس جرگے میں اس مسئلے پر لمبی بحث چلی اور بہت سوچ بچار کے بعد ملک کی آزادی کی لڑائی میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا گیا۔

انگریزوں نے محسوس کیا کہ کسی نہ کسی طرح خدائی خدمت گاروں کو کانگریس سے دور رکھا جانا چاہیے۔ انہوں نے پٹھانوں کے بیچ کانگریس کی طرف سے بدگمانی پھیلانی شروع کی۔ یہ بات خوب اچھالی گئی کہ کانگریس ہندوؤں کی پارٹی ہے، جبکہ خدائی خدمت گار مسلمان ہیں۔ انگریزوں نے یہ جتلانے کی بھی کوشش کی کہ کانگریس اپنے مفاد میں خدائی خدمت گاروں کا استعمال کر رہی ہے۔ اور بعد میں پختونوں کے ساتھ دغا کرے گی۔ خدائی خدمت گاروں کو روپے سے پیسے اور زمین جائداد کا بھی لالچ دیا گیا مگر انگریزوں کی ایک نہیں چلی۔ بدشاہ خاں دیکھ رہے تھے کہ انگریز کس طرح مذہب کا نام لے کر روپے پیسے اور زمین کا لالچ دے کر پختونوں میں پھوٹ ڈالنے کے درپے ہیں مگر انہوں نے خدائی خدمت گاروں کو انگریزوں کی ہر پیشکش ٹھکرانے پر راضی کر لیا۔

خدائی خدمت گاروں نے 1929 کے بڑے جرگے میں اعلان کیا تھا کہ پختون لوگ برصغیر ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑنے والے اپنے بھائیوں کا ساتھ دیں گے۔

اس بارے میں کانگریسی لیڈروں کے ساتھ تفصیلی بات چیت بھی ہوئی تھی۔ یہ طے پایا تھا کہ بادشاہ خاں اور ان کے ساتھیوں کے جیل میں رہتے ہوئے کانگریسی لیڈر صوبہ سرحد کا دورہ کریں گے۔

1930 میں سردار ولبھ بھائی پٹیل نے کانگریس کا ایک وفد سرحد بھیجا۔ پختونوں نے اسے بہت پسند کیا انگریزوں نے اس وفد کو صوبہ سرحد تک پہنچنے سے روکنے کا بہت جتن کیا تھا مگر یہ لوگ وہاں پہنچ ہی گئے۔

کانگریسی وفد کے ممبروں نے گاؤں میں جاکر لوگوں سے ملاقات کی اور پولیس اور فوج کی زیادتیوں کے واقعات کی معلومات حاصل کیں۔ مقامی زندگی اور معاشی حالات کا جائزہ لیا۔ انھوں نے اندازہ لگایا کہ اس علاقے میں پینے کے پانی، غذا، کپڑے اور روزگار کے مواقع پیدا کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ انھوں نے لوگوں سے امن، بھائی چارے اور آزادی کی لڑائی میں ان کی ذمہ داریوں کے بارے میں بھی بات چیت کی۔

واپس لوٹنے پر وفد نے اپنے اس دورے کی ایک رپورٹ تیار کی۔ یہ رپورٹ ہندوستان کی کئی اخباروں میں چھپی۔ انگریزی حکمراں فوراً حرکت میں آگئے۔ انھوں نے ان چھپی ہوئی خبروں کو ضبط کرنا شروع کر دیا۔ مگر کانگریس والوں نے اس رپورٹ کی کاپیاں خفیہ طور سے انگلینڈ اور امریکہ بھیج دیں تاکہ صوبہ سرحد کے اصلی حالات دنیا کے سامنے آسکیں۔ بادشاہ خاں کے کارناموں کی شہرت ہندوستان بھر میں پھیل چکی تھی۔ اور اب مغربی ملکوں کے بیدار مغز حلقوں کی ہمدردیاں بھی انھیں حاصل ہوگئیں۔

انگریزی حکمرانوں کو جب اس سلسلے میں منہ کی کھانی پڑی تو انھوں نے خدائی خدمت گار تحریک کو کچلنے کے لئے نئی چال بازیاں بھی شروع کر دیں۔ وہ کانگریس لیڈروں پر دباؤ ڈالنے لگے کہ وہ خدائی خدمت گاروں کی مدد کرنا بند کر دیں۔ انگریزوں کی

دلیل تھی کہ مسلم لیگ کی رہنمائی میں ہندوستان کے مسلمان خدائی خدمت گاروں کی مدد کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ کانگریس اگر پختون تحریک میں مدد دیتی ہے تو ہندوستان کے مسلمانوں میں بدگمانی پھیلے گی۔ ان میں علاحدگی کا جذبہ بڑھے گا۔ انگریزوں کی دلیل تھی کہ اس طرح کانگریس پارٹی پوری طرح ہندوؤں کی پارٹی کی شکل میں نظر آنے لگے گی۔ مگر مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور سردار پٹیل جیسے کانگریسی لیڈروں نے انگریزوں کی چال سمجھ لی اور خدائی خدمت گاروں کو اخلاقی . سیاسی اور مالی تعاون دینا بند نہیں کیا۔

مارچ 1931 میں تاریخی "گاندھی اِروِن" سمجھوتہ ہوا۔ اس کے بعد بڑی تعداد میں سیاسی لیڈروں کو رہا کر دیا گیا۔ مگر بادشاہ خاں کو اب بھی نہیں چھوڑا گیا۔ مسلم لیگ کا ایک وفد بادشاہ خاں سے ملاقات کے لیے بھیجا گیا تاکہ کانگریس سے ناطہ توڑنے پر انہیں راضی کیا جاسکے۔ بادشاہ خاں نے وفد سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ مسلم لیگ نے کبھی خدائی خدمت گاروں کی مدد نہیں کی اور وہ پختونوں کے دوست نہیں ہیں۔

کچھ پٹھان لیڈروں نے گاندھی جی تک یہ بات پہنچائی کہ بادشاہ خاں ابھی تک جیل میں ہیں۔ گاندھی جی نے وائسرائے سے ملاقات کی اور کہا کہ بادشاہ خاں کو فوراً رہا کر دیا جائے، کیونکہ وہ بھی انڈین نیشنل کانگریس کے ممبر ہیں۔ لارڈ اِروِن یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھے کہ بادشاہ خاں اہنسا پر یقین رکھتے ہیں۔ گاندھی جی کا اصرار بڑھنے پر انہیں 1931 میں جیل سے رہا کیا گیا۔

"اٹھ جاؤ"

صوبہ سرحد لوٹنے پر بادشاہ خاں کا ایک بڑے سورما کی طرح خیرمقدم کیا گیا۔ لوگ

انہیں پہلے سے زیادہ غریب اور کمزور نظر آئے مگر جدوجہد کرنے کا ان کا ولولہ کافی بڑھا ہوا تھا۔

بادشاہ خاں نے ہزاروں پٹھانوں کے درمیان اپنی مشہور تقریر کی۔ "انہوں نے کہا کہ انگریزوں کا ایک سینگ ٹوٹ چکا ہے، پٹھانو! اب یہ دوسرا سینگ بھی مروڑ دو۔ خدا نے یہ ملک تمہیں اور تمہاری اولادوں کو دیا ہے۔ مگر آپسی پھوٹ اور لڑائی جھگڑے کی وجہ سے غیرملکیوں نے تمہارا سرزمین پر قبضہ کر لیا ہے، حالانکہ خدا نے انہیں بھی ان کا الگ ملک دیا ہے۔ تمہارے بچوں کو بھوکا رکھ کر ہی غیرملکی امیر بنے ہوئے ہیں۔ اٹھو اور یہ دوسرا سینگ بھی توڑ دو۔"

لوگ جس جوش خروش سے بادشاہ خاں کا استقبال کر رہے تھے اس سے انگریزوں کی گھبراہٹ بڑھ گئی۔ انگریزوں نے اپنی زیادتیوں اور چال بازیوں کا چکر پھر چلانا شروع کیا۔ کچھ خدائی خدمت گاروں سے بات چیت میں حکام نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ بادشاہ خاں کی شہرت تو دن دونی رات چوگنی بڑھ رہی ہے مگر عام خدائی خدمت گاروں کی مصیبت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ سارا کام تو آپ لوگ کرتے ہیں مگر ساری واہ واہ بادشاہ خاں لوٹ رہے ہیں۔ آپ ان سے کسی طرح کم نہیں ہیں مگر لیڈری کے مزے بادشاہ خاں لوٹ رہے ہیں۔

اس چالبازی میں بس ایک ہی دو آدمی آئے، جو بادشاہ خاں پر انگریزوں سے سمجھوتہ کرنے کے لئے زور ڈالنے لگے، بادشاہ خان نے اس سے صاف انکار کردیا۔ ان کا کہنا تھا کہ خدا نے خدمت خلق کا جو موقع دیا ہے وہ اس کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے۔

جلدی ہی کانگریس کاسالانہ اجلاس 1931 میں کراچی میں ہوا جس کے صدر سردار پٹیل تھے۔ بادشاہ خاں کی قیادت میں ہزاروں خدائی خدمت گار لال قمیص پہنے اس

اجلاس میں شریک ہوئے۔ کراچی کے راستے میں خدائی خدمت گار لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ انھوں نے لوگوں کو آزادی کی لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی ترغیب دی۔ کراچی اجلاس میں بادشاہ خاں کی شرکت سے کانگریسیوں کے حوصلے کافی بڑھ گئے۔ اس سے کانگریس زیادہ ہمہ گیر جماعت کی شکل میں دکھائی دینے لگی۔ اس سے کانگریس مضبوط ہوئی اور دور دراز کے سرحدی علاقے سے لے کر جنوبی ہندوستان تک نمائندگی کرنے کا اس کا دعویٰ مضبوط ہوا۔

بادشاہ خاں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر بن گئے۔ اس طرح وہ سارے ہندوستان کی آزادی کی لڑائی کے چوٹی کے سورماؤں میں شمار ہونے لگے۔

کانگریس اور خدائی خدمت گاروں کا میل جول ملک کے مختلف علاقوں، مذہبوں، ہندو مسلمان اور سکھوں کے درمیان اتحاد کا نشان بن گیا۔ یہ لوگ ملک کو آزاد کرانے کی لڑائی میں متحد ہوئے تھے۔

بادشاہ خاں کی تقریروں، تحریروں، ان کے دوروں اور جلسے جلوس کی خبریں ہندوستان بھر کے اخباروں میں کافی نمایاں طور پر چھپنے لگیں۔ سارے ملک میں ان کی شہرت ہوگئی۔ ہندوستان کے لوگ ان سے بے پناہ محبت کرنے لگے۔ اب سارے ملک میں ان کا اس طرح احترام کیا جانے لگا جیسا کہ صوبہ سرحد میں کیا جاتا تھا۔ انہیں "سرحدی گاندھی" کہا جانے لگا۔

ایک فقیر، ایک رہنما

انگریزوں نے بادشاہ خاں پر ڈورے ڈالنے کے کئی طرح سے جتن کئے مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ بادشاہ خاں اس سلسلے میں صوبہ سرحد کے اس زمانے کے چیف کمشنر سر رالف گریفتھ سے اپنی ملاقات کا خاص طور سے ذکر کرتے تھے۔ سر گریفتھ نے اس

ملاقات میں بادشاہ خاں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ صوبہ سرحد کا جغرافیائی وقوع اور سیاسی صورت حال ایسی ہے کہ وہاں کے لوگوں اور برطانیہ کے مفادات ایک جیسے ہوگئے ہیں۔ یہ ملاقات برطانوی ڈپلومیسی کا حصہ تھی۔ اس ملاقات میں سر گریفتھ نے تین قسم کے خطروں کی طرف اشارہ کیا، جو پختون عوام اور برطانوی ہندوستان کے لئے ایک جیسے تھے۔ یہ تین خطرے بتائے گئے سرحد کے قبائلی، افغانستان اور کمیونسٹ روس۔

بادشاہ خاں نے اس پر صفائی دی کہ قبائلیوں کو خطرہ نہیں تصور کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے سرحدی قبائلیوں کے ساتھ پرامن تعلقات اور دوستی بڑھانے کی کچھ عملی تدبیریں بھی بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ قبائلیوں کی سماجی اصلاح کی جانی چاہیے۔ انگریزوں کو اپنی قبائلی پالیسی ترک کرکے انھیں دشمن کی بجائے دوست سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے دلیل دی کہ "قبائلیوں کو مارنے اور دبانے پر جو رقم خرچ کی جاتی ہے، اس کی آدھی رقم بھی اگر ان علاقوں میں گھریلو صنعت وغیرہ کو فروغ دینے پر خرچ کی جائے تو یہ مفلس قبائلی باعزت زندگی گذارنے کے قابل بنائے جاسکتے ہیں۔ اگر آپ وہاں اسکول قائم کریں تو اس سے ان کے بچوں کو نئی زندگی گزارنے کا موقع مل سکے گا۔ اسپتال قائم کریں تو انھیں دوا علاج کی سہولت میسر آجائے گی۔ اس سے بہادر قبائلی سماج کے مفید رکن بن جائیں گے جس کا سارے ملک کو فائدہ پہنچے گا۔"

افغان خطرے کے بارے میں بادشاہ خاں نے رائے دی کہ "افغان ہمارے بھائی ہیں۔ اگر پٹھانوں کے ساتھ دوستی بڑھائی گئی تو افغانستان بھی آپ کا دوست بنے گا۔"

جہاں تک کمیونسٹ روس سے خطرے کا تعلق ہے، اس کا سب سے اچھا راستہ یہ ہے کہ پختونوں کے واجب حقوق تسلیم کرلئے جائیں۔ انھیں آزادی دے دی جائے۔ ہمارا ایک بڑا ملک ہے آموندی سے پنجاب تک کا علاقہ کوئی چھوٹا ملک نہیں

ہوسکتا۔ اگر کوئی ہم پر حملہ کرے گا تو ہم جان کی بازی لگاکر اپنی حفاظت کریں گے۔"

یہ دیکھتے ہوئے کہ بادشاہ خاں کسی طرح جھکنے کو تیار نہیں ہیں، انہیں 1931 میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا، اور خدائی خدمت گاروں کے خلاف تشدد کا بازار پھر گرم ہوگیا۔ ان اشتعال انگیزیوں کے باوجود خدائی خدمت گار تحریک پرسکون اور پرامن ہی رہی۔ یہ صرف بادشاہ خاں کی دین تھی۔ بادشاہ خاں کا کہنا تھا کہ یہ صرف سیاسی تحریک نہیں ہے یہ ایک روحانی تحریک بھی ہے، جو پٹھانوں میں بھائی چارے اور محبت کا پیغام عام کرتی ہے اور ان میں حب الوطنی، ایثار اور فرض شناسی کے جذبے کو روشن کرتی ہے۔

گرفتاریوں، جیل بھیجنے اور دوسری ظالمانہ کارروائی کے باوجود یہ تحریک پھلتی پھولتی رہی۔ عوام کا بڑا طبقہ اس تحریک سے ہمدردی کرنے لگا۔ اسی وجہ سے انگریزوں کو کہنا پڑا کہ "عدم تشدد کا پیرو پٹھان، تشدد پر آمادہ پٹھان سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔"

تین سال قید کے بعد بادشاہ خاں کو رہا کیا گیا۔ مگر انہیں صوبہ سرحد اور پنجاب جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بادشاہ خاں اس عرصے میں شمالی ہندوستان میں رہے۔ وہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور دوسرے کانگریسی لیڈروں سے ملنے بہار گئے۔ بعد میں وہ واردھا پہنچے اور مہاتما گاندھی کے ساتھ سیواگرام آشرم میں رہنے لگے۔

اس سال یعنی 1934 میں کانگریس کا سالانہ اجلاس بمبئی میں ہونے والا تھا۔ کانگریس کی استقبالیہ کمیٹی نے بادشاہ خاں کو کانگریس کا صدر منتخب کرنے کا فیصلہ کیا۔ بادشاہ خاں کو اس سلسلے میں ڈاکٹر راجندر پرشاد کا ایک تار ملا۔ یہ ان کے لئے ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ مگر بادشاہ خاں نے اسے قبول کرنے سے معافی مانگ لی۔ ان کا کہنا تھا کہ "میں تو ایک عام سیاسی سپاہی ہوں، میں ایک خدائی خدمت گار ہوں اور صرف خدمت کے کاموں میں لگا رہنا چاہتا ہوں۔"

ہندوستان کے سیاسی منظرنامے میں بادشاہ خاں کی حیثیت اس سے کافی بڑھ گئی۔ ان کے جلسوں میں لوگوں کی بھیڑ جمع ہونے لگی۔ انگریز جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ پیدا کرنے می سرگرم تھے، اس وقت بادشاہ خاں کی شخصیت ہندو مسلم اتحاد کا ایک نشان بن گئی۔ بادشاہ خاں کلکتہ گئے جہاں بہت گرم جوشی سے ان کا استقبال ہوا۔ وہ بنگال کے گاؤوں میں بھی گئے۔ ان کا ماننا تھا کہ گاؤں کے لوگ کسی بھی طرح کمزور اور پست ہمت نہیں ہیں۔ "ان کے اندر دبی چنگاری کو بس ذرا کریدنے کی ضرورت ہے۔"

واردھا واپس آنے پر بادشاہ خاں نے گاندھی جی سے بات چیت کرکے مشرقی ہندوستان کا ایک اور دورہ کرنے کا پلان بنایا۔ مگر انگریز بادشاہ خاں کے بڑھتے اثرات سے بہت پریشان تھے۔ دسمبر 1934 میں انہیں پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اب انہیں دو سال کی سزا سنائی گئی۔ ان پر بمبئی میں انڈین کرسچین ایسوسی ایشن میں بھڑکانے والی تقریر کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس تقریر میں انہوں نے خدائی خدمت گار تحریک اور صوبہ سرحد میں اپنے تجربات بیان کئے تھے۔

بادشاہ خاں کو پہلے بمبئی اور پھر سابرمتی کی جیل میں رکھا گیا۔ جیل میں انہیں ان کی حیثیت کے مطابق سہولتیں نہیں دی گئی تھیں۔ ان کو اچھا کھانا نہیں ملتا تھا، ان کے لئے ایک باورچی رکھا گیا تھا مگر وہ آدمی ٹی۔ بی۔ کا مریض تھا۔ یہ بات بہ آسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ اس کے پیچھے کیا منشا ہوسکتی ہے۔

انتخابات

سزا کی مدت پوری ہونے پر 1936 میں انہیں جیل سے رہا کیا گیا۔ اس بار بھی ان پر سرحدی صوبے جانے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ بادشاہ خاں واردھا آگئے۔ اگست

1937 میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات مکمل ہوجانے پر ہی بادشاہ خاں کو صوبہ سرحد جانے کی اجازت مل سکی۔

انتخاب میں خدائی خدمت گار پارٹی کو صوبے میں اکثریت مل گئی۔ مگر گورنر نے اس کے باوجود سر نواب صاحبزادہ قیوم کو حکومت بنانے کے لئے مدعو کیا۔ مگر یہ حکومت اسمبلی میں اپنی اکثریت نہیں ثابت کر سکی اور عدم اعتماد کی تجویز پاس ہوجانے سے یہ سرکار گر گئی۔

بادشاہ خاں کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب نے خدائی خدمت گاروں کے تعاون سے حکومت بنائی۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد دوسری جنگ عظیم چھڑ جانے پر کانگریس نے صوبائی حکومتوں سے استعفیٰ دے دیا اور ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت بھی دست بردار ہوگئی۔

دوسری جنگ عظیم

دوسری جنگ عظیم چھڑ جانے پر گاندھی جی اور بادشاہ خاں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا چونکہ یہ لوگ جنگ اور تشدد کے کٹر مخالف تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ برطانیہ کو جنگ میں مدد دینے کا مطلب ہے تشدد کی حمایت کرنا اور اُسے بڑھاوا دینا۔ گاندھی جی کے انفرادی ستیہ گرہ پروگرام کے لئے بادشاہ خاں کو صوبہ سرحد کا پہلا ستیہ گرہی چنا گیا۔

جنگ کے دوران انگریزوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی سے بہت سختی سے نپٹنا چاہا۔ گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس نے ایک بڑی عوامی تحریک شروع کرنا ضروری سمجھا۔ گاندھی جی نے اگست 1942 میں " ہندوستان چھوڑو " تحریک شروع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس دوران بادشاہ خاں صوبہ سرحد میں آزادی کی تحریک کے

روح رواں بن گئے تھے۔ انہوں نے جرگوں کی بیٹھکیں بلاکر تحریک کے طور طریقوں پر لوگوں سے صلاح مشورے کیے۔

تحریک کے رہنماؤں کی اخلاقی حیثیت کافی صاف تھی۔ جرگہ کی ایک بیٹھک میں یہ تجویز رکھی گئی کہ ٹیلی فون کے تار کاٹ دیے جائیں اور ریل کی پٹریاں اکھاڑ دی جائیں۔ اس پر بادشاہ خاں نے یہ شرط لگادی کہ ایسا کرنے والا اپنا کام کرکے فوراً پولیس کو اس سے آگاہ کردے۔ ایسا کرنے سے لوگوں میں اخلاقی جرات پیدا ہوگی، اور دوسرے کارکنوں میں حوصلہ پیدا ہوگا۔ پھر اس سے کسی بے گناہ پر شک کی گنجائش نہیں رہے گی۔ اور پولیس کو بے قصور لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کا موقع نہیں مل پائے گا۔ اس طرح صوبہ سرحد میں یہ تحریک بہت نظم و ضبط سے چلی۔ حکام نے جو بھی ظلم ڈھائے لوگوں نے بہادری سے ان کا سامنا کیا۔

بادشاہ خاں ستیہ گرہ کو آگے بڑھانے اور دوسرے کاموں کا جائزہ لینے بار بار صوبے کا دورہ کرتے۔ ایک دن کوہاٹ جاتے ہوئے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اور پشاور لاکر چھوڑ دیا گیا۔ دوسرے دن جب وہ پھر دورے پر نکلنے جارہے تھے انہیں گرفتار کر لیا گیا اور پھر پشاور لاکر چھوڑ دیا گیا۔ اس طرح انگریز ان کے پروگراموں میں خلل ڈالتے رہے۔

بادشاہ خاں اس میں پوری طرح ثابت قدم رہے۔ انہوں نے کچھ لوگوں کو جمع کیا اور چار سدا کے راستے مردان روانہ ہوگئے۔ راستے میں انہوں نے کئی جلسوں کو خطاب کیا۔ ہر گاؤں میں انہوں نے دیکھا کہ پولیس انہیں گرفتار کرنے کی تاک میں لگی ہوئی ہے۔

بادشاہ خاں نے لوگوں سے کہا کہ وہ ہاتھ سے ہاتھ باندھ کر ایک ساتھ مارچ کریں۔ اس پر بھی پولیس نے ان پر حملے کیے۔ بہت سے لوگوں کو مار کر گرا دیا گیا۔ مگر اس اشتعال کے باوجود آزادی کا ہر سپاہی پوری طرح اہنسا کے اصول پر قائم رہا۔ یہ منظر دیکھ کر پولیس کے لوگوں نے جو سکھ تھے اپنی لاٹھیاں پھینک دیں اور بادشاہ خاں سے معافی

مانگنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ "آپ ایک فقیر ہیں انصاف کی لڑائی لڑ رہے ہیں اور وہ بھی پوری طرح پرامن طریقے سے۔ آپ کے دل میں محبت اور دوستی کا جذبہ ہے ہم نے آپ لوگوں کو بہت ستایا، مارا پیٹا مگر آپ نے ہمارے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔" انہوں نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور ان کی دعاؤں کے طلب گار ہوئے۔

بادشاہ خا کو 1943 میں پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اب انہیں ہری پور ہزارہ سنٹرل جیل میں رکھا گیا۔ انہوں نے وہاں مرغیاں پال لیں، مرغیوں کو وہ خود دانا پانی دیتے۔ دانا دیتے وقت مرغیاں دوڑ کر ان کے پاس آجاتیں۔ کچھ ان کے کاندھے اور سر پر چڑھ جاتیں اور ان کے ہاتھ میں رکھے دانے کھاتیں۔

جیلوں کے انسپکٹر جنرل کرنل اسمتھ ایک بار اس جیل کے معائنے پر آئے۔ انہوں نے بادشاہ خاں کو مرغیوں کو دانا دیتے ہوئے دیکھا، جس میں انسانیت کا ایک سبق پوشیدہ تھا۔ بادشاہ خاں نے کہا کہ "میں ان پرندوں سے محبت کرتا ہوں، اس لئے وہ مجھ سے نہیں ڈرتے۔ مرغیاں میرے سر اور کاندھے پر بیٹھ جاتی ہیں، انہیں میرے لمبے چوڑے ڈیل ڈول سے ڈر نہیں لگتا۔ اگر ہم محبت سے جانوروں اور پرندوں کا دل جیت سکتے ہیں تو کیا انسانوں کو محبت سے نہیں جیتا جاسکتا۔" اس بات نے کرنل اسمتھ کو بہت متاثر کیا وہ ملازمت چھوڑ کر واپس اپنے وطن چلے گئے۔

جنگ کے بعد 46-1945 میں اسمبلیوں کے انتخاب ہوئے۔ انگریز چاہتے تھے کہ صوبہ سرحد میں کسی طرح مسلم لیگ اقتدار میں آجائے۔ مسلم مذہبی رہنماؤں کی خدمات حاصل کرکے مسلم لیگ کے حق میں فضا بنانے کی کوشش کی گئی۔ وہاں ایک نعرہ یہ چلایا جارہا تھا کہ ہمیں ہندوستان اور پاکستان کے بیچ یا مندر اور مسجد کے بیچ چناؤ کرنا ہے۔ یہ پرچار بھی کیا گیا کہ مسلمانوں کو مسلم لیگ کو ہی ووٹ دینا چاہیئے کیونکہ کانگریس ہندوؤں کی پارٹی ہے۔

بادشاہ خاں اور ان کے ساتھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ انگریزی حکمرانوں کا ہی سیاسی پروپیگنڈا ہے۔ خدائی خدمت گار اسلام کی اصل روح اور مفہوم کو سمجھتے تھے۔ یہ باتیں انھوں نے کئی برس سے چل رہی اپنی تحریک کے دوران سیکھی اور سمجھی تھیں۔ الیکشن کے وقت انگریزوں نے کچھ اور چالیں بھی چلیں۔ بوگس ووٹ ڈلوانے اور الیکشن بوتھ پر قبضہ کرنے جیسی باتیں بھی ہوئیں۔ مگر مسلمانوں کی اکثریت والے صوبہ سرحد میں مسلم لیگ ہار گئی۔ خدائی خدمت گاروں نے یہ الیکشن بھی جیت لیا۔

جولائی 1946 میں خدائی خدمت گاروں نے سرحد کی اسمبلی کی طرف سے بادشاہ خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کو مرکزی دستور ساز اسمبلی کے لئے منتخب کیا۔ یہ دستور ساز اسمبلی ہندوستان کا دستور یا کانسٹی ٹیوشن ترتیب دینے کے لئے بنائی گئی تھی۔

رائے شماری

انگریز یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد صوبہ سرحد ایک علاحدہ اکائی بن جائے یا آزاد ہندوستان میں شامل ہو۔ اس وقت سیاست شطرنج کی چالوں کی طرح ساز باز سے بھری ہوئی تھی۔ الیکشن میں بادشاہ خاں اور ان کی خدائی خدمت گار کی جیت کے باوجود انگریزوں نے سرحد میں رائے شماری کرانے کا حکم جاری کردیا۔ بادشاہ خاں نے اس کی مخالفت کی اور اسے ٹھکرا دیا۔ انھوں نے لوگوں سے رائے شماری کا بائکاٹ کرنے کی اپیل کی مگر یہ رائے شماری کرائی گئی جس میں بہت کم لوگوں نے حصہ لیا۔ اس رائے شماری کی آڑ میں مسلم لیگ کو موقع مل گیا۔ صوبہ سرحد کو پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں کی فہرست میں ڈال دیا گیا۔ اس رائے شماری میں بہت سے غیرقانونی ہتھ کنڈے اپنائے گئے۔ مگر زیادہ تر آبادی نے اس کا بائیکاٹ کیا اور مٹھی بھر لوگوں نے ہی ووٹ ڈالنے میں حصہ لیا۔ اس کے بعد ہندوستان کی تقسیم کا چکر

تیزی سے گھومنے لگا۔ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ پاکستان کا حصہ بنا دیا گیا۔

بادشاہ خاں نے یہ بات بہت شدت سے محسوس کی کہ ان کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد

ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی دونوں ملکوں کے سرحدی علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات بھڑک اٹھے۔ تشدد کے ان واقعات سے بادشاہ خاں بہت رنجیدہ ہوئے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی کہ فسادات بھڑکانے میں مسلم لیگ کا کتنا ہاتھ ہے۔ انہوں نے فسادات سے متاثر علاقوں کا دورہ کیا۔ وہ بہار اور بنگال گئے۔ پنجاب اور دلی کے دورے میں انہیں عام آدمیوں کو سیدھے راستے پر لانے میں کچھ کامیابی بھی ملی۔ انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والے حسد اور کینہ سے اس طرح کی کارروائی کر رہے ہیں۔ انہوں نے صوبائی حکومتوں کو اجڑے اور بے گھر ہونے والوں کی آبادکاری کے مفید مشورے دیے۔ یہ بادشاہ خاں ہی تھے جنہوں نے نواکھالی کے بعد گاندھی جی کو بہار کے دورے پر آنے کے لئے تیار کیا تھا۔

صوبہ سرحد میں ہندو اقلیت میں تھے۔ بادشاہ خاں کے خدائی خدمت گاروں نے انہیں فرقہ وارانہ حملوں سے بچائے رکھا۔ ہندؤوں اور سکھوں کے مکانوں کی حفاظت کے لئے پٹھان دن رات پہرے دیتے۔ دس ہزار خدائی خدمت گاروں کی ٹولی لال قمیص پہنے پشاور پہنچ گئی اور امن کی فوج کی طرح کام کرنے لگی۔ ان لوگوں کے پہنچتے ہی پشاور میں حالات معمول پر آگئے۔ اور دکانیں اور بازار کھل گئے۔

آزادی سے پہلے بادشاہ خاں 15 سال جیلوں میں رہ چکے تھے۔ مگر تقسیم کے بعد پاکستانی حاکموں نے انہیں 16 سال جیلوں میں ڈالے رکھا۔ پاکستانی حکومت نے ان پر

جرمانہ بھی عائد کیا تھا۔ ان کی ذاتی ملکیت ضبط کر لی گئی تھی۔ بادشاہ خاں کہا کرتے تھے کہ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستانی حکومت کس جرم میں مجھے اور ہزاروں خدائی خدمت گاروں کو اتنے سال جیلوں میں بند رکھ رہی ہے۔" پاکستان جس طرح بنایا گیا تھا بادشاہ خاں کا دل کبھی اس سے راضی نہیں ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ "شاید میرے دل میں کبھی پاکستان سے محبت نہیں پیدا ہوسکے گی۔ پاکستان کا قیام محبت کی بجائے نفرت پر ہوا ہے جو کینہ پروری اور بغض سے پرورش پارہا ہے۔ پاکستان انگریزوں کے اشارے پر بنا ہے تاکہ ہندو اور مسلمان ہمیشہ کے لئے یہ بھول جائیں کہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔"

پاکستانی جیلوں میں 16 سال گزارنے اور جنوری 1988 تک اپنی زندگی کے باقی دنوں میں ان کا ایک ہی مقصد رہا کہ کسی طرح سرحدی صوبے کے لوگوں کو بہتر زندگی میسر آسکے۔ وہ بار بار حکومت پاکستان اور دنیا کی رائے عامہ سے اس کے لئے اپیل کرتے رہے۔ وہ کہتے تھے کہ "آج میری ساری جدوجہد ظلم اور بربریت کے خلاف ہے۔ پٹھانوں نے آخر کیا جرم کیا ہے کہ اس غیور قوم کو جان بوجھ کر برباد کیا جارہا ہے۔ کسی قوم کو دبانے کے لئے ناجائز طور طریقے کیوں روا رکھے جارہے ہیں۔ میرا بس یہی ایک خواب ہے کہ بلوچستان سے چترال تک کے سارے پٹھان بھائی چارے کی ڈور میں بندھ جائیں۔ وہ اپنے قومی کردار کو پہچانیں۔ خدا اور اس کے بندوں کی خدمت کے لئے دنیا کی قوموں میں اپنا جائز مقام حاصل کریں۔"

آخری زمانہ

21 جنوری 1988 کو 98 سال کی عمر میں بادشاہ خاں کا انتقال ہوا۔ افغانستان کے جلال آباد میں ان کے جنازے میں ہندوستان کے مجاہدین آزادی کی ایک جماعت

شریک ہوئی۔ یہ جماعت غم سے مغلوب اور ان کے احسانوں کے بوجھ سے دبے ہوئے ملک ہندوستان کی طرف سے آخری خراج عقیدت پیش کرنے گئی تھی۔ بادشاہ خاں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ پختون عوام اور ساری انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ سرگرم رہے۔

بادشاہ خاں کو ہندوستان میں ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا گیا۔ وہ ایثار اور بے لوث خدمت کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ ان کی قیادت اخلاقی جرات کا بے مثل نمونہ تھی۔

بادشاہ خاں بہادری، محبت اور انسان دوستی کی ایک مثال تھے۔ وہ خدمت کو خدا کی عبادت کا درجہ دیتے تھے وہ ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے۔

میگھ ناد ساہا

دلیپ م۔ سالوی

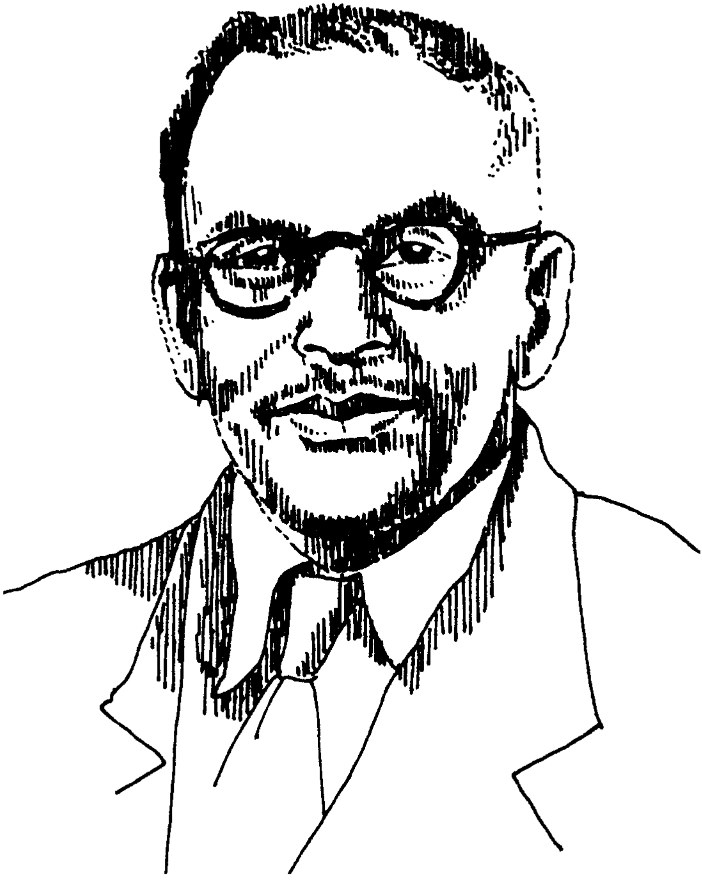

"سستی اور دوسروں پر انحصار جو ہمارے کردار کا ایک حصہ بن چکے ہیں انہیں خود اعتمادی اور محنت اور مشقت کی عادت سے بدل دینا ضروری ہے۔ ہمارے لئے یہی واحد راستہ ہے۔ اس ملک کے نوجوانوں کے دل میں غربت کو ختم کرنے، صنعت و حرفت بیوپار اور روزگار کے دوسرے ذریعوں کو غیر ملکیوں کے پنجوں سے نکال کر خود سنبھال لینے کی لگن پیدا ہونی چاہئے۔ انہیں اب اس جدوجہد کے لئے تیار ہوجانا چاہئے کہ مستقبل میں اپنے تمام قدرتی ذرائع سے زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جاسکے۔ اس کام کے لئے تیاریاں بڑے پیمانے پر شروع ہوچکی ہیں۔ یہ ایک ایسی چنوتی ہے جو پوری زندگی کی انتھک محنت چاہتی ہے اور اس کے لئے جس چیز سے سب سے پہلے چھٹکارا پانا ضروری ہے وہ ہے "قسمت پر انحصار"۔"

میگھ ناد ساہا

میگھ ناد ساہا

وہ ایک طوفانی رات تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی اور ایک چھوٹے سے مکان کے باہر تیز بارش ہورہی تھی۔ اسی ماحول میں ایک نئے جنم لینے والے بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے، موسم کی مناسبت سے اس بچے کا نام "میگھ ناد" یعنی "بادلوں کی کڑک" رکھا گیا۔

اور وہ بچہ سچ مچ طوفان ثابت ہوا۔ اس نے سائنس کی دنیا میں ہلچل مچا دی۔ اس کی سائنسی کھوج نے ملک میں فلکی طبیعات جیسے علم کے مطالعے اور تحقیق کی بنیاد ڈال دی۔

میگھ ناد ساہا، زندگی بھر اس کوشش میں لگے رہے کہ ہندوستان کے سائنس دانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لایا جائے۔ ان کی صلاحیتوں کا استعمال ملک کی ترقی کے لئے کیا جائے۔ انہیں پکا یقین تھا کہ ایک آزاد اور خودمختار ہندوستان اس وقت تک اپنا کوئی راستہ نہیں بنا سکتا جب تک وہ سائنس اور تکنالوجی کے معاملے میں اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوجاتا۔ انہوں نے ملک میں بدیسی کارخانے قائم کرنے کی سخت مخالفت کی۔ وہ بات بہت کھری کرتے تھے مگر

نرمی کے ساتھ۔

وہ پارلیمنٹ کے لئے بھی چنے گئے تھے۔ وہ پہلے سائنس داں تھے جنہوں نے سائنس کو بڑھاوا دینے کے مقصد سے ملکی سیاست میں قدم رکھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک کی ترقی میں سائنس دانوں کو پوری وقعت دی جائے ان کا خیال تھا کہ وہ سیاسی حیثیت بناکر سائنس کو فروغ دینے میں زیادہ کچھ کرسکتے ہیں مگر ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ ان کا جلدی ہی انتقال ہوگیا۔

میگھ ناد ساہا 6 اکتوبر 1893 کو ضلع ڈھاکہ کے ایک چھوٹے گاؤں سیوراتالی میں پیدا ہوئے تھے۔ جو اب بنگلہ دیش میں ہے۔ میگھ ناد ساہا کے باپ کی گاؤں میں پرچون کی دوکان تھی۔ بڑی مشکل سے گھر کا خرچ پورا ہوپاتا تھا۔ میگھ ناد پڑھائی میں تیز تھے مگر والدین آگے کی تعلیم دلانے کی حیثیت میں نہیں تھے۔ انہوں نے ساہا کو دکان پر ہی بٹھا لیا۔ وہ اپنے ماں باپ کی پانچویں اولاد تھے۔ پانچویں جماعت سے آگے اس گاؤں میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ سب سے قریب کا مڈل اسکول دس کلو میٹر دور تھا۔ اگر ساہا کے استادوں نے زور نہ ڈالا ہوتا تو وہ پانچویں جماعت سے آگے نہیں پڑھ سکتے تھے۔ گاؤں کے ایک ڈاکٹر نے ساہا کی ذمہ داری لے لی۔ وہ ان کے گھر کے چھوٹے موٹے کام کرنے لگے اور آگے کی پڑھائی کے لئے اسکول جانے لگے۔

ساہا کو ریاضی یعنی میتھمیٹکس میں خاص دلچسپی تھی۔ تاریخ پڑھنے میں بھی انہیں مزہ آتا تھا۔ وہ بہت شوق سے راجپوت اور مرہٹے سورماؤں کی بہادری کے قصے پڑھا کرتے تھے۔

باغی

میگھ ناد میں ایک انقلابی جذبہ تھا جو بعد کی ان کی زندگی میں پروان چڑھا۔ اس جذبے کی ایک جھلک اس وقت دیکھنے کو ملی، جب انگریزی حکومت نے 1905 میں بنگال کی تقسیم کا اعلان کر دیا۔ اس فیصلے کے خلاف لوگوں میں کافی غم و غصہ تھا۔ جگہ جگہ مظاہرے ہو رہے تھے۔ اس فیصلے کی مخالفت میں سارا بنگال کھڑا ہو گیا تھا۔ نو عمر میگھ ناد اور ان کے دوستوں نے حکومت کی زیادتی کو محسوس کیا۔ وہ اس فیصلے کے خلاف مظاہرہ کرنا چاہتے تھے، مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیسے مظاہرہ کریں۔

مگر انہیں جلدی ہی اس کا موقع مل گیا۔ برطانوی گورنر اسکول کے معائنے پر آنے والا تھا۔ گورنر کے اسکول پہنچنے پر میگھ ناد اور ان کے کچھ ساتھیوں نے اس کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گورنر کی بے عزتی کرنے کی سزا میں انہیں اسکول سے نکال دیا گیا۔ آزادی کے بعد اسی اسکول نے انہیں اعزاز بخشا) نکالے گئے لڑکوں میں سب سے زیادہ گھاٹا میگھ ناد کا تھا۔ ان کا وظیفہ بھی واپس لے لیا گیا تھا۔ اب میگھ ناد کے سامنے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ کشوری لال جوبلی اسکول میں داخلہ لے لیں۔ یہ ایک پرائیوٹ اسکول تھا۔ اسکول کی طرف سے ان کے وظیفے کا انتظام بھی کر دیا گیا۔ اس اسکول سے میگھ ناد نے میٹرک امتحان میں سارے مشرقی بنگال میں اول پوزیشن حاصل کی۔

1909 میں انہوں نے ڈھاکہ کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں انہوں نے جرمن زبان پڑھنی شروع کی۔ اس وقت انہیں یہ احساس ہو چکا تھا کہ سائنس کے میدان میں جرمنی آگے ہے اور اچھا سائنس داں بننے کے لئے جرمن زبان سیکھنی چاہئے۔ گویا

اس وقت تک میگھ ناد ساہا سائنس داں بننے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

1911 میں وہ پریسیڈینسی کالج میں داخل ہوئے۔ یہاں ماحول کافی اچھا تھا۔ یہاں شخصیت کو نکھارنے کا زیادہ اچھا موقع تھا۔ ان کے استادوں میں ہندوستان کے مایۂ ناز سائنس داں جے۔ سی۔ بوس اور پی۔ سی۔ رے شامل تھے۔ بوس نباتاتی طبیعات کے ماہر تھے اور وائرلیس کے موجدوں میں شمار کئے جاتے تھے جبکہ رے کیمیا کے ماہر تھے اور ملک میں کیمیاوی صنعتوں کے پھیلاؤ میں ان کا کافی ہاتھ تھا۔

سبھاش چندر بوس، ایس۔ این۔ بوس اور پی۔ سی مہالونوبس جیسے طالب علم ان کے کالج اور ہوسٹل کے ساتھیوں میں تھے۔ ان سبھی نے آئندہ زندگی میں ملکی اور عالمی سطح پر شہرت پائی۔

جہاں دلیل اور بحث مباحثے کا موقع ہوتا وہاں میگھ ناد سب سے آگے رہتے۔ ان کے ساتھی انھیں "ناقابلِ تسخیر ساہا" کہا کرتے تھے۔ بی۔ ایس۔ سی۔ اور ایم۔ ایس۔ سی۔ کے امتحانوں میں ان کی دوسری پوزیشن رہی۔ پہلی پوزیشن ایس۔ این۔ بوس نے حاصل کی جنھوں نے بعد میں جدید علم طبیعات (نئی فزکس) میں کافی نمایاں کارنامہ انجام دیا۔

انسانیت سے ہمدردی

کالج کے زمانے میں میگھ ناد ساہا اپنے استاد پی۔ سی۔ رے کے بہت قریب رہے۔ وہ انھیں اپنا آدرش مانتے تھے۔ رے کنوارے تھے اور ہمیشہ کھدر پہنتے تھے اور بہت سادہ زندگی گذارتے تھے۔ حب الوطنی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا

ہوا تھا۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ملک جلد سے جلد آزاد ہوجائے۔ وہ چاہتے تھے کہ سائنس اور تکنالوجی کے سہارے جتنی جلدی ہوسکے ملک سے غریبی دور کر دی جائے۔ ساہا نے ان کی سادہ زندگی اور بلند خیالات کے فلسفے کو اپنایا اور کچھ میدانوں میں وہ اپنے استاد سے کافی آگے نکل گئے۔

1913 میں دامودر ندی میں بھیانک باڑھ آئی اور ہزاروں لوگ بے گھر ہوگئے، مویشی اور عمارتوں کی بھاری بربادی ہوئی۔ میگھ ناد پہلے طالب علم تھے جو سیلاب زدہ لوگوں کی امداد کے کاموں میں آگے آئے۔ سیلاب زدہ لوگوں کے دکھ درد نے اس نوجوان کے دل پر بہت اثر ڈالا۔ بعد کی زندگی میں بھی وہ سیلاب سے متاثر لوگوں کی امداد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ ان کی ہی سفارش پر سیلاب کے اسباب کا پتہ لگانے کے لئے ایک ادارہ قائم ہوا اور دامودر ندی کی باڑھ پر قابو پانے کے لئے دامودر ندی پر ایک بڑا باندھ بن سکا۔

ایک معلم

ایم۔ ایس۔ سی۔ پاس کرنے کے بعد ساہا کو کام کی تلاش ہوئی۔ وہ گھر والوں کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے ان کی ماں امتحان کی فیس ادا کرنے کے لئے اپنے زیور بیچ چکی تھیں۔ اسکول کی فیس اور اپنے چھوٹے بھائی کا کلکتہ میں خرچ اٹھانے کے لئے انہوں نے ٹیوشن پڑھانا پہلے ہی شروع کر دیا تھا۔ ٹیوشن کے لئے وہ دور دور سائیکل سے اور کبھی پیدل جایا کرتے تھے کیونکہ اس وقت وہ بس یا ریل سے سفر کرنے کا خرچ نہیں اٹھا سکتے تھے۔

اس زمانے میں "انڈین فائنس سروس" کی بہت دھوم تھی۔ حکومت برطانیہ

کی یہ سروس کافی منافع بخش مانی جاتی تھی۔ میگھ ناد اس سروس کے امتحان میں بیٹھنا چاہتے تھے مگر انگریزی حکومت نے انہیں امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی۔ بچپن میں برطانوی گورنرز کا بائیکاٹ کرنے اور انقلابیوں کے ساتھ ان کے تعلقات ان کے راستے میں رکاوٹ بن گئے۔

مگر خوش قسمتی سے کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اسوتوش مکرجی پہلے سے میگھ ناد اور ایس۔ این۔ بوس کی قابلیت سے واقف تھے۔ انہوں نے دونوں کو ریاضی کے شعبے میں پڑھانے کی پیشکش کی۔ یہ شعبہ نیانیا کھلا تھا، مکرجی اسے ترقی دینا چاہتے تھے۔ ساہا کی عمر اس وقت مشکل سے 23 سال تھی۔ انہیں ریاضی پڑھانے کا شوق تھا۔ مگر اس علم کی جدید کتابیں اور تحقیقی رسالے انہیں میسر نہیں تھے۔ دونوں نوجوان استادوں نے شروع میں ان مشکلات کی طرف عہدے داروں کا دھیان دلانے کی کوشش کی مگر جلدی ہی ان کی سمجھ میں آگیا کہ انہیں سب کچھ اپنے ہی طور پر کرنا ہے۔

ریسرچ (تحقیق)

یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی جنگ عظیم ختم ہی ہوئی تھی۔ انگلینڈ یا جرمنی سے کوئی نئی کتاب یا رسالہ ہندوستان نہیں آرہا تھا۔ ساہا اور بوس نے جدید فزکس کے میدان میں ہوئے کام اور آئنسٹائن کے انقلابی نظریے یعنی نظریہ اضافت Theory of Relativity کے بارے میں سن رکھا تھا۔ اور اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بہت دوڑ دھوپ کے بعد انہیں ایک ریٹائرڈ جرمن سائنس داں کا پتہ مل گیا جو کلکتہ میں ہی رہتے تھے۔ ان لوگوں نے

فزکس کی کچھ نئی کتابیں ان سے حاصل کیں ۔ یہ کتابیں جرمن زبان میں تھیں۔ دونوں کو جرمن زبان آتی تھی۔ ان لوگوں نے نہ صرف فزکس کے جدید رجحانات کو سمجھا بلکہ طالب علموں کو اس کے بارے میں پڑھایا بھی۔ آئنسٹائن کے نظریہ اضافت کا تو انہوں نے انگریزی میں ترجمہ بھی کر ڈالا۔ ساری دنیا میں یہ انگریزی کا پہلا ترجمہ ثابت ہوا۔

سینیئر ساتھیوں سے کچھ اختلافات ہونے کی بنا پر ساہا فزکس کے شعبے میں چلے گئے ۔ اس شعبے میں دستیاب معمولی وسائل کے سہارے ہی انہوں نے "روشنی کا دباؤ" ناپنے والا ایک بہت حساس قسم کا آلہ بنا لیا۔ ان کے اس کارنامے پر کلکتہ یونیورسٹی نے انہیں ڈی۔ ایس۔ سی (D. Sc.) کی ڈگری دی ۔ اس وقت وہ صرف 25 سال کے تھے ۔

1918 میں میگھ ناد ساہا کی شادی رادھا رانی رائے سے ہوئی۔ ان کے تین بیٹے اور چار لڑکیاں ہوئیں۔ ان میں سے صرف بڑا بیٹا اجیت ہی باپ کے نقش قدم پر چلا اور فزکس میں نام پیدا کیا ۔ رادھا رانی بہت پڑھی لکھی نہیں تھیں، مگر ساہا کی کوششوں میں ہمیشہ ساتھ دیتی رہیں ۔

ایسٹرو فزکس (Astrophysics)

اس دوران ساہا کی دلچسپی ایسٹرو فزکس یا فلکیاتی طبیعات میں ہوگئی ۔ ایگنس کلارک کی عام فہم سائنس کی کتابوں کے مطالعے سے ان میں یہ دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ ایسٹرو فزکس کے مسائل سے واقف ہوئے اور ستاروں اور سورج وغیرہ کے مطالعے کی طرف وہ خاص طور سے متوجہ ہوئے ۔

ہر کسی نے آسمان پر دھنک دیکھی ہوگی۔ مگر بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ سورج سے آنے والی کرنوں سے ہی یہ رنگ برنگی دھنک بنتی ہے۔ تیز بارش کے بعد پانی کے کچھ قطرے آسمان میں معلق رہ جاتے ہیں۔ جب ان پر سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو ان میں سے سات رنگ پھوٹ پڑتے ہیں۔ یہ رنگ ہوتے ہیں۔ بنفشی (Violet)، نیلا (Indigo)، آسمانی (Blue)، ہرا (Green) نارنجی (Orange)، اور لال (Red)۔ انہیں مختصر کرکے انگریزی میں (VIBGYOR) کہتے ہیں۔ مگر قدرتی روشنی کی کمی زیادتی کے سبب ان میں سے کچھ رنگ زیادہ نمایاں ہوجاتے ہیں۔ ایک تجربہ گاہ یا لیباریٹری میں بھی یہ دھنک بنائی جاسکتی ہے۔ کسی مخروطی شیشے سے سورج کی کرنوں کو گزار کر یہ دھنک بنائی جاسکتی ہے۔ یہ مخروطی شیشہ سورج کی کرنوں کو سات رنگوں میں منتشر کر دیتا ہے جسے Spectrum یا عکسی شعاع کہتے ہیں۔ سورج کی اس عکسی شعاع یا اسپکٹرم کی طرف میگھ ناد ساہا نے خاص توجہ دی۔ ابھی تک فلکیات کے ماہرین کے لئے یہ خاص موضوع بنا ہوا تھا۔

1859 میں گستاف رابرٹ کرچوف (87 ـ 1824) نے سورج کی اس عکسی شعاع یا اسپکٹرم کا مطالعہ کرکے یہ بات دیکھی تھی کہ اس پر گہری کالی لائنیں پھیلی رہتی ہیں۔ اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ سورج میں سوڈیم کیلشیم، اور اس طرح کے کچھ دوسرے مادے موجود ہیں۔ جب یہ مادے تپتے ہیں تو ان کی روشنی سے گہری کالی لائنوں والی عکسی شعاع پیدا ہوتی ہے۔ کرچوف اور اس کے ساتھیوں نے اس سے اندازہ لگایا کہ سورج بہت زیادہ گرم ہے اور اس پر ایسے مادے موجود ہیں جو کرہ زمین پر پائے جاتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد جب اسپکٹرم کا اور گہرائی سے مطالعہ کیا

گیا تو واضح قسم کی سیاہ لائنوں کے درمیان اور سیکڑوں سیاہ لائنیں پائی گئیں۔ مگر یہ کون سے مادوں کو ظاہر کرتی ہیں فزکس اور فلکیات کے ماہروں کے لئے یہ معمہ بنا ہوا تھا۔

اس موضوع پر ایک جرمن سائنس داں کا تحقیقی مضمون پڑھتے ہوئے ساہا کے دماغ میں بھی یہ معمہ گھومنے لگا۔ وہ سوچنے لگے کہ سائنس کے ماہر اب تک اس کا اطمینان بخش جواب کیوں نہیں ڈھونڈ پائے ہیں اور کیا یہ معمہ کسی اور بہتر طریقے سے حل کیا جاسکتا ہے۔ اس پر انہوں نے تحقیقات شروع کر دی۔

پچھلے پچیس سال میں سورج اور ستاروں کی عکسی شعاع کے بارے میں مختلف رسالوں میں جو مضامین چھپے تھے، میگھ ناد ساہا نے ان سب کو چھان مارا۔ وہ اس گتھی کو سلجھانے میں لگ گئے اور اس کی ایک تشریح کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ یورپ اور امریکہ کے سائنس داں جس کی صحیح تشریح نہیں کرسکے وہ میگھ ناد ساہا کے لئے کیسے ممکن ہوگیا۔ یہ اس لئے ہوا کہ وہ ایک ماہر ریاضی داں تھے اور فزکس کے اصولوں کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ریاضی کی بنیاد پر انہوں نے فضا، سورج اور ستاروں کے اندر کی کیفیات سے ایٹم کا تعلق قائم کیا۔ اور اس طرح جدید علم فلکیات میں ایک نئے موضوع کی بنیاد ڈالی۔

" انجان خلائی شے" (Exotic heavenly objects) کا مطالعہ جدید فلکیات کا اہم موضوع ہے جیسے پلسر (pulsars) کاسرس (quasars) اور سپرنوا (Supernova) وغیرہ کا مطالعہ۔ یہ سب یوں تو ستاروں کے زمرے میں ہی آتے ہیں مگر داخلی حالات کے اختلاف کے سبب مختلف انداز میں کارفرما ہوتے ہیں۔

آیونائزیشن کا فارمولا (Ionisation Formula)

ایٹم میں مرکزی نیوکلیس کے گرد چکر لگانے والے الیکٹران ہوتے ہیں۔ نیوکلیس میں مثبت قوت ہوتی ہے۔ جبکہ الیکٹران میں منفی قوت ہوتی ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں مثبت اور منفی قوتیں اک دوسرے میں توازن قائم رکھتی ہے۔ اس میں ایٹم کی حیثیت غیرجانبدارانہ ہوتی ہے۔ اگر گرمی یا دباؤ کی وجہ سے دونوں قوتوں کا توازن بگڑ جائے تو الیکٹران کو ایٹم سے خارج ہونا پڑ جاتا ہے اس سے ایٹم میں ایک مثبت قوت بنی رہ جاتی ہے اسے آیون (Ion) یا برق پارہ کہتے ہیں۔ میگھ ناد ساہا نے دعوی کیا کہ سورج یا کسی اور ستارے میں موجود مختلف مادوں کے ایٹم گرمی کی شدت اور بے انتہا دباؤ کے سبب آیون یا برق پاروں میں تبدیل ہوچکے ہیں۔ انھوں نے دعوی کیا کہ یہی آیون یا برق پارے سورج کی عکسی شعاع اسپیکٹرم میں دکھائی دینے والی گہری لائنیں بناتے ہیں۔ ان برق پاروں کے عمل اور ردعمل کا ریاضی کے اصولوں سے مطالعہ کرکے انھوں نے اپنا فارمولا بنایا جو - ساہا کے تھرمل آیونائزیشن " کے فارمولے کے نام سے مشہور ہوا۔ اس سے سورج یا کسی اور ستارے کے داخلی ماحول میں موجود درجہ حرارت یا دباؤ کا اندازہ لگانا ممکن ہوا۔

انھوں نے اپنے اس مفروضے کی بنیاد پر ایک مقالہ لکھا جو لندن کی فلاسفیکل میگزین میں اکتوبر 1926 کے شمارے میں چھپا۔ فلکیات کے ماہرین کو شروع میں ساہا کے اس فارمولے پر شک ہوا کیونکہ اس میں پہلی بار ایٹم اور ستاروں کے درمیان تعلق قائم کیا گیا تھا مگر بعد کے تجربات سے انھیں اس کی صداقت پر یقین ہونے لگا۔ برطانیہ اور امریکہ کے بہت سے سائنس دانوں نے

اس فارمولے کی تعریف کی اور اس پر آگے تحقیق اور مطالعہ جاری رکھنے پر زور دیا۔ برطانیہ کے ماہر فلکیات آرتھر سی۔ ایڈنگٹن نے "انسائکلوپیڈیا برٹینیکا" میں اسے علم فلکیات کی بارہویں بڑی تحقیق تک بتایا۔ انہوں نے لکھا کہ 1596 میں ڈیوڈ فیبریسس نے ستاروں کے بارے میں جو تحقیق کی تھی اور پہلا بدلتے رہنے والا ستارہ variable star "میراسیٹ" معلوم کیا تھا اس کے بعد علم فلکیات میں ساہا کی تحقیق ایک نمایاں کام ہے۔

اس فارمولے پر کلکتہ یونیورسٹی نے انہیں "گرفتہ انعام" دیا۔ 1919 میں انہیں پریم چند رائے چند وظیفہ بھی ملا۔ اس وظیفے سے وہ بیرون ملک میں اپنا مطالعہ جاری رکھ سکتے تھے۔

تجربہ گاہوں میں اپنے اس فارمولے کا مشاہدہ کرنے کے مقصد سے ساہا نے بیرون ملک کا سفر کیا۔ انہوں نے جو فارمولا بنایا تھا اس پر تجربہ بہت ہی زیادہ اونچے درجہ حرارت اور دباؤ میں کیا جاسکتا تھا جو ہندوستان کی تجربہ گاہوں میں ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنا تجربہ یورپ کی کسی بڑی تجربہ گاہ میں کرنا چاہتے تھے، مگر ان کی بدقسمتی تھی کہ لندن کے امپیریل کالج اور جرمنی کی برلن یونیورسٹی میں اپنے قیام کے دوران وہ اس تجربے کے لئے ضروری آلات اور لوازمات کا انتظام نہیں کرسکے۔ مگر اس دوران انہوں نے سورج اور دوسرے ستاروں کی عکسی شعاع کے بارے میں جدید ترین اعداد و شمار کی بنیاد پر اپنا مطالعہ جاری رکھا۔

ساہا کے اس فارمولے کو کرّہ زمین پر فطری طور پر ظہور میں آنے والی باتوں کو سمجھنے میں مفید پایا گیا۔ مثال کے طور پر اس زمین کے گرد دوڑنے والی برقی لہر کو سمجھنے میں اس سے مدد ملی۔ اس لہر کے ذریعہ ریڈیو پیغامات منتقل ہوتے ہیں۔ ساہا

نے بعد میں خود بھی برقیاتی فضا (Ionosphere) کا مطالعہ کیا۔ اس فارمولے کی مدد سے شعلوں کی ماہیت، برقی قوس اور دھماکوں کے رد عمل کو سمجھنے میں مدد ملی۔

سہولتوں کا فقدان

وطن واپس لوٹنے پر 1921 میں ساہا کلکتہ سائنس کالج میں آ گئے۔ یہاں وہ اپنے فارمولے کے تجربے کے لئے ایک لیباریٹری قائم کرنا چاہتے تھے۔ مگر انہیں وہاں ضروری سہولت نہیں مل سکی۔ وہ تازہ طور پر قائم ہوئی الہ آباد یونیورسٹی گئے۔ مگر یہاں بھی انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ملی۔ تحقیقاتی کاموں کے لئے انہیں مالی امداد اور ضروری سامان نہیں مل سکا۔ ان کے بہت سے ساتھی فزکس میں ان کے کام کرنے کی مخالفت کرنے لگے۔ ان میں سے کچھ نے ان کے فارمولے کو ایک دھوکہ تک بتانا شروع کر دیا۔

مگر 1927 میں لندن کی مشہور رائل سوسائٹی کا فیلو منتخب ہونے پر ملک کے سائنس دانوں کو ان کے فارمولے کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا۔ مگر رائل سوسائٹی اور برطانوی گورنر کے علاوہ اور کسی نے انہیں مطالعے کے لئے مالی مدد دینے کی پیشکش نہیں کی۔ اس بات نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آخر ہندوستان میں سائنسی تحقیق کے لئے مالی وسائل کیوں میسر نہیں ہیں۔

بیرون ملک کے سفر کے دوران میگھ ناد ساہا دیکھ چکے تھے کہ ان ملکوں کی حکومت اور صنعت کار سائنسی تحقیق کو ملک کی ترقی کے کاموں میں کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی طرف سے سائنسی تحقیق کی تجربہ گاہیں بنائی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں اس وقت کوئی ایک بھی تجربہ گاہ قائم نہیں ہوئی تھی۔ سائنسی تحقیق کا کچھ تھوڑا

بہت کام یونیورسٹیوں میں ہو رہا تھا۔ یونیورسٹیوں میں کام کرنے والے سائنس داں اپنے تحقیقی کاموں کو آگے بڑھانے میں بہت دشواری محسوس کرتے تھے۔ ایک تو ضروری سہولتوں کی کمی تھی دوسرے ضابطوں کی پابندی سے طرح طرح کی مشکلات پیدا ہوتی تھیں۔

ساہا نے محسوس کیا کہ ملک کے سائنس دانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی بہت ضرورت ہے جس سے وہ یونیورسٹیوں میں سائنسی تعلیم اور تحقیق کے لئے سہولتیں بڑھانے کی جدوجہد مل جل کر کر سکیں۔ انہیں یہ بھی محسوس ہوا کہ ملک میں سائنسی تحقیق کا کام کافی بکھرا ہوا ہے اور ان میں ہندوستان جیسے غریب ملک کی ضروریات پر توجہ بھی نہیں دی جا رہی ہے۔

سائنس اور ملکی ترقی

اس سلسلے میں ساہا کا ایک نمایاں کام 1930 میں الہ آباد میں یوپی اکیڈمی آف سائنس کا قیام تھا۔ اس ادارے کو آج نیشنل اکیڈمی آف سائنس کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پہلی بار سائنس دانوں کو ملکی ترقی میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوا تھا۔ ساہا نے انڈین سائنس کانگریس کے سالانہ اجلاس میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا۔ ملک کے انقلابی لیڈر سبھاش چندر بوس کی انھیں پوری مدد حاصل تھی۔ ساہا اس بات کی پرزور وکالت کرتے تھے کہ ہندوستان سے غریبی دور کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر صنعتی ترقی ضروری ہے۔ ساہا کی سفارش پر 1935 میں راجدھانی میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس قائم ہوا۔ آج اس ادارے کا نام انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی ہے۔ یہ ایک قومی ادارہ ہے جو سائنسی تحقیق کے

کاموں میں تال میل بنائے رکھتا ہے اور سائنس اور تکنالوجی کے معاملے میں حکومت کو مشورے دیتا ہے۔

ساہا محسوس کرتے تھے کہ سائنس دانوں کا کام دنیا سے کٹ کر تجربہ گاہوں میں بند ہوجانے کا نہیں ہے۔ انہیں اپنی الگ دنیا میں گم نہیں ہوجانا چاہیئے۔ ملک کی ترقی کے لئے سائنس کی اہمیت سب کو معلوم ہونا چاہیئے اور عام آدمی کو بھی سائنس سے باخبر رکھنا چاہیے۔

1938 میں جب وہ کلکتہ واپس لوٹے تو انہوں نے وہاں انڈین سائنس نیوزی ایجنسی قائم کی۔ اس کا مقصد عام آدمی کو سائنسی کاموں سے متعارف رکھنا تھا۔ اس ایسوسی ایشن کی طرف سے انہوں نے ایک رسالہ " سائنس اینڈ کلچر " جاری کیا۔ یہ رسالہ برطانیہ کے مشہور جرنل "نیچر" کے طرز پر نکالا گیا تھا اگلے دس بارہ سال وہ اس رسالے کے توسط سے سائنس اور تکنالوجی سے متعلق مختلف قومی اور بین الاقوامی موضوعات پر اپنے خیالات کی تشریح کرتے رہے۔ انہوں نے ایک سو سے زیادہ مضامین لکھے جو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ قومی پلاننگ، سائنسی تعلیم، صنعت و حرفت، جیوفزکس، سیلاب اور قحط پر قابو پانے کی تدبیریں، ایٹمی فزکس، کیلنڈر کی اصلاحات اور آثار قدیمہ جیسے موضوعات پر ان کے مضامین شائع ہوئے۔ اس سے ان کی مختلف دلچسپیوں کی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ان کی تحریروں کا کتنا اثر ہوتا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دامودر ندی میں ہر سال آنے والے سیلاب کے اسباب کا پتہ لگانے کے موضوع پر انہوں نے ایک مضمون لکھا تھا، جس کے بعد 1942 میں کلکتہ کے پاس " انسٹی ٹیوٹ آف ہائیڈرولکس اینڈ ریور ریسرچ آف بنگال " قائم کیا گیا۔ اس کے اگلے سال

جب دامودر ندی میں پھر بھیانک باڑھ آئی تو ساہا حالات کا جائزہ لینے وہاں گئے اور راحت کے کاموں میں حصہ لیا۔ اس باڑھ میں کافی جانی اور مالی نقصان ہوا تھا۔ انہوں نے تباہی مچانے والی اس ندی کو "آسائشیں پہنچانے والی ندی" بنانے کے موضوع پر کئی مضامین لکھے ۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر سال ندی کے پشتوں کو مضبوط اور اونچا کرنے کے عارضی کاموں سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ دامودر اور اس کی معاون ندیوں کے آر پار اسی طرح کا باندھ بنانے کی ضرورت ہے جیسا کہ امریکہ کی ٹینیسی ندی کی باڑھ پر قابو پانے کے لئے بنایا گیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح کا باندھ بنانے سے برسات کے دنوں میں باڑھ کے پانی کو روک کر جمع کیا جاسکتا ہے۔ اس سے بجلی بنائی جاسکتی ہے، اور کھیتوں کو نہروں سے پانی دیا جاسکتا ہے۔

ساہا کے خیالات کی بنیاد پر امریکہ کے "ٹینیسی ویلی کارپوریشن" کے طرز پر دامودر ویلی کارپوریشن قائم کیا گیا اور باندھ کے بن جانے سے سیلاب کے مسئلے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قابو پالیا گیا۔

نیوکلیر فزکس

ساہا جب میونخ (جرمنی) میں تھے، انہیں نیوکلیائی تحقیق کے بارے میں پتہ چلا تھا۔ نیوکلیائی قوت کی یہ تحقیق اوٹوہان، فرٹزاسٹراسمین اور لیسے میتھزنے کی تھی۔ انہیں ہندوستان جیسے غریب ملک کے لئے نیوکلیائی قوت سے بجلی تیار کرنے کا خیال پیدا ہوا۔

ملک واپس آنے پر انہوں نے اپنے طالب علموں کو اس طرف متوجہ کیا اور

ان سے اس سے متعلق تحقیقاتی کام کرنے پر زور دیا۔ اس طرح کائناتی شعاع (کاسمک ریز) کا مطالعہ شروع ہوا۔ فضا سے آنے والی برقی قوت سے بھرپور ان شعاعوں پر تجربے کا یہ کام دارجلنگ کی پہاڑی پر کیا گیا۔ جب یہ کاسمک ریز ہماری فضا میں موجود ایٹم اور مالیکیولوں پر پڑتی ہیں تو وہ اور چھوٹے ریزوں میں پھٹ جاتے ہیں۔ ان باریک ریزوں کے مطالعے سے ایٹم اور اس کے نیوکلیس کی داخلی بناوٹ کے بارے میں ایک نئی بصیرت پیدا ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں کاسمک ریز کا یہ مطالعہ نیوکلیائی فزکس کے مطالعے کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

نیوکلیائی قوت سے بجلی پیدا کرنے کے امکان نے میگھ ناد ساہا میں ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا۔ کلکتہ یونیورسٹی کے طالب علموں کو وہ خود یہ مضمون پڑھانے لگے۔ عوام کو اس سے واقف کرنے کے لئے انہوں نے مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ انہوں نے 1941 میں پہلی بار اس موضوع کو یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کرایا۔ وہ اس کے لئے یونیورسٹی میں ایک الگ لیباریٹری قائم کرنا چاہتے تھے۔ مگر قانون اور ضابطوں کی پابندیوں اور سرمائے کی کمی کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

مختلف وسائل سے چندے حاصل کرکے انہوں نے ایک سائکلوٹرون (cyclotron) قائم کرنے کا خاکہ تیار کیا۔ کاسمک ریز کے ذریعہ ایٹم کی داخلی بناوٹ کا مشاہدہ قدرتی ماحول میں ہوتا ہے جبکہ سائکلوٹرون میں یہی مطالعہ مصنوعی حالات میں کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ ایٹم کو منتشر کرنے والی ایک مشین ہوتی ہے۔

ساہا نے اپنے طالب علموں کو اس مشین کے کل پرزے لانے اور ان پر کام کرنے کی ٹریننگ حاصل کرنے امریکہ بھیجا۔ اس وقت دوسری جنگ عظیم چل

رہی تھی اور امریکہ سے کل پرزوں کو فوراً لانے میں دقت تھی۔ لمبے انتظار کے بعد 1950 میں یہ سائکلوٹرون نصب کیا جاسکا۔ اسے کلکتہ میں تازہ طور پر قائم ہوئے انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیر فزکس میں لگایا گیا۔ ساہا نے نیوکلیر فزکس کی جو چھوٹی سی لیباریٹری بنائی تھی، یہ ادارہ اسی کی ترقی یافتہ شکل تھا۔ اب اس ادارے کو "ساہا انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیر فزکس" کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ساہا کی بدولت ہی کلکتہ یونیورسٹی کے کیمپس میں بائیوفزکس کا ایک علاحدہ شعبہ قائم ہوا۔ اسی شعبے میں ملک کی پہلی الیکٹران خوردبین (electron microscope) نصب کی گئی۔ یہ بہت طاقتور خوردبین تھی اور دنیا کی کچھ گنی چنی الیکٹران خوردبینوں میں اس کا شمار تھا۔

آزادی کے بعد

ملک اس دوران 1947 میں آزاد ہوچکا تھا۔ مگر سائنس اور دیسی تکنالوجی کو پوری اہمیت نہ دیے جانے سے وہ بہت ناخوش تھے۔ اپنے رسالے "سائنس اینڈ کلچر" میں اور اپنی تقریروں میں تیل کی کھوج کے کام میں غیرملکی کمپنیوں کو شامل کرنے کی وہ برابر مخالفت کرتے رہے۔ وہ اس بات کے بھی خلاف تھے کہ غیرملکی کمپنیوں کو ہندوستان میں صنعتیں لگانے کی اجازت دی جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک کے سائنس دانوں اور تکنالوجی کے ماہروں کے سہارے ہی ملک میں بڑی صنعتوں کا جال بچھایا جائے۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ ملک کی ترقی کے منصوبے بنانے میں سائنس دانوں کی صلاح لی جایا کرے۔ مگر ساہا اور ان کے نظریات کو نظرانداز کیا گیا۔

ان کے دوستوں اور بہی خواہوں نے ان کے دل میں یہ خیال پکا کر دیا کہ حکومت سے باہر رہ کر انہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اپنے خیالات کے مطابق کام کرنے کے لئے انہیں سیاست میں قدم رکھنا چاہیے۔ چنانچہ 1951 کا انتخاب انہوں نے شمال مغربی کلکتہ کے حلقہ سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے لڑا اور کامیاب ہوئے۔ ممبر پارلیمنٹ کی حیثیت سے ان سے بہت سے کاموں کی امید کی جاتی تھی، مگر ان کی زندگی نے وفا نہیں کی۔ نئی دلی کی پارلیمنٹ اسٹریٹ پر چہل قدمی کرتے وقت ان پر دل کا زبردست دورہ پڑا اور 16 فروری 1956 کو ان کا انتقال ہوگیا۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں ملک میں بھاری صنعتوں کے فروغ کے لئے جو بندوبست کیا گیا، اسے دیکھنے کے لئے وہ زندہ نہیں رہ سکے۔

ساہا کو ملک کا ایک مایۂ ناز سائنس داں تسلیم کرلیا گیا تھا مگر ان کے اندر ایک چھوٹے سے گاؤں کی زندگی کی روح ہمیشہ باقی رہی جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔ وہ سادے کپڑے پہنتے، کھری بات کہتے اور بات کرنے میں اکثر مصلحتوں کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ ان کے دل و دماغ پر ہر وقت سائنس اور اپنے ملک کے لوگوں کے مسائل چھائے رہتے۔

" ایمانداری سے لگاتار کام کرنا " ان کی زندگی کا اصول تھا اور زندگی بھر وہ اپنے اصول پر قائم رہے۔

" عام طور پر سائنس داں اپنی ایک الگ دنیا میں رہتے ہیں اور دنیا کی حقیقتوں سے اپنے دماغ پر بوجھ نہیں ڈالتے۔ میں اپنے بچپن کے چند برسوں کو چھوڑ کر جن میں کچھ سیاسی تحریکوں میں لگا تھا۔ 1930 تک خود بھی ایک ایسی ہی الگ تھلگ دنیا میں رہتا تھا۔ لیکن آج کے دور میں انتظامی شعبو میں سائنس اور تکنالوجی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ کم سے کم اتنی اہمیت تو رکھتے ہی ہیں جتنی قانون اور نظم و نسق۔ میں سیاست میں بہت آہستہ آہستہ صرف اس لئے اترا کہ میں چاہتا تھا کہ میں جس لائق بھی ہوں اپنے ملک کے کاموں میں کچھ ہاتھ بٹا سکوں۔

میگھ ناد ساہا